

انتساب

۷۵۷

کالا دھندہ کرتے والوں کے نام  
جوشل انسان کے قاتل ہیں

# سرگوشی

اندھی راہیں۔ اُن لوگوں کی داستانِ اَلْم ہے جو دولت کی خاطر۔  
اپنی خواہشات کی خاطر۔ دوسروں کو زہر دیتے ہیں۔ یہ لوگ کیسے ہیں۔؟  
اس بات کا اندازہ آپ کو مینا جی کی اس تحریر سے ہو جائے گا۔ کہ  
انسان خود غرضی کی کس حد تک پہنچ چکا ہے۔

زیرِ نظر تحریر۔ ایک ایسے انسان کی داستان ہے جو اپنے حینِ مستقبل  
کی خاطر کالا دھندہ شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اسے کیا کچھ کھونا پڑتا  
ہے۔ یہ تو وہی جانتا ہے، بیوی بچے اور سب سے اہم وہ احساس  
جو انسانی زندگی کو حرارت بخشتا رہتا ہے اور اس سے چھین جاتا ہے  
دوسروں کو زہر دینے والے خود کب جیتے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں  
کے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی زہر بن جاتے ہیں

یہ کہانی اندھی خواہشات کی کہانی ہے۔ پڑھیے اور اپنی رائے

بے نوازیے۔

(اخلاک)



سنٹرل جیل کے داخلی گیٹ سے باہر نکلنے والا انسان گو پنتالیس سال کا چہرے پر غبار لے ہوئے تھا۔ لیکن صحت اس کے باوجود قابل شک تھی۔ اپنی صحت کے بل بوتے پر وہ اپنی عمر سے دس سال کم نظر آ رہا تھا۔ کنٹیوں پر چند ایک بال چاندی لے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ ہر لحاظ سے ایک اسمارٹ اور خوب رو نوجوان نظر آ رہا تھا۔ تقریاً پچیس کے بہترین سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ انسان اپنی غیر معمولی حیثیت کو باور کرا رہا تھا۔ اس کی چال میں ایک وقار تھا۔ ایک نمکنت اور ٹھہراؤ تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے سرک پر کھڑی سیاہ رنگ کی بوک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس سیاہ رنگ کی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک موٹا سا انسان سیاہ چشمہ لگائے اور ہونٹوں میں سگار دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ جیل سے نکلنے والا۔

نوجوان گاڑی کے قریب آکھڑا ہوا۔ اندر بیٹھے ہوئے ہوئے اور بھرے  
ہونٹوں والے نے سگار ہونٹوں سے نکال کر آنے والے کی طرف مڑاتی  
ہوئی نظروں سے دیکھا اور بولا۔

”بیٹھ جاؤ وارث! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“  
”تم نکلی ہو؟“ وارث اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔  
”ٹھیک پہچانا تم نے وارث۔ ایک سال پہلے ہی تو ملے تھے۔“  
”مجھے یاد ہے کہ ہم ایک سال پہلے کہاں ملے تھے۔ مجھے تمہاری صورت  
سے نفرت ہے۔ آئندہ تم میرے سامنے مت آنا اور اپنے گرد گھنٹال  
سے کہہ دینا کہ وارث اس قدر لاوارث نہیں تھا جو اُسے یوں نظر انداز  
کیا گیا۔ لہذا اس گاڑی کو لے جاؤ، میں اب کام نہیں کروں گا۔“  
”یہ گاڑی تمہارے لئے باس نے نہیں بھیجی تھی۔“ موٹا جس کا  
نام نکلی تھا، سگار کا کوند چباتے ہوئے بولا۔

لیکن وارث ایک تیز جھٹکے سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب اس کے  
ہونٹ بھنپے ہوئے تھے۔ چہرے کے خوب صورت نقوش پر کڑی پید ہو  
گئی تھی۔ پھر قریب سے گزرتی بدنی خالی ٹیکسی کو اس نے رکنے کا اشارہ  
کیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پشت سے ٹیک لگا  
بیٹھا تھا۔ چہرے پر اب بھی کڑی کے آثار بدرجہ اتم موجود تھے۔ ٹیکسی



شاداب نگر کی طرف اڑے جا رہی تھی۔ وارث نے بیٹھتے وقت ڈرائیو  
سے کہیں چلنے کو کہا تھا۔ راستے میں اس نے ٹیکسی ایک جگہ رکوائی تھی۔  
اور ڈرائیور کو گولڈ لیف کا پکیٹ لانے کو کہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب ٹیکسی دوبارہ روانہ ہوئی تو وارث کے ہونٹوں میں  
سگریٹ دبا ہوا تھا۔ شاداب نگر میں اس کا فلیٹ تھا۔ جو اس نے کرایہ  
پر حاصل کیا ہوا تھا۔ گو وہ ایک سال سے بند تھا اور اسے یقین تھا  
کہ بلڈنگ کے مالک نے تالا توڑ کر اس کا سامان باہر نہیں پھینکا ہوگا۔  
کیونکہ جب اس نے وہ فلیٹ حاصل کیا تھا تو پورا پانچ ہزار روپیہ  
ایڈوانس ادا کیا تھا۔ اس کے فلیٹ میں ضروریات زندگی کی ہر شے موجود  
تھی۔ دیکھا جائے تو اس بلڈنگ کے تمام فلیٹس میں سے زیادہ قیمتی سامان  
اور دلفریب آرائش سے مزین فلیٹ تھا۔ جب ٹیکسی شاداب نگر میں داخل  
ہو کر حجاز بلڈنگ کے سامنے رکی تو وارث نے اسے کرایہ دے کر فارغ  
کر دیا اور بڑے باوقار انداز میں وہ فلیٹ تک لے جانے والی سیڑھیوں  
کی طرف بڑھا تھا۔ پہلے فلور پر بلڈنگ کا مالک تین خوب صورت کمرے  
کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھا اور اسی لائن کے آگے بیس پچیس قدموں کے  
فاصلے پر خود وارث کا فلیٹ تھا۔ جیب سے چابی نکال کر اس نے  
فلیٹ کا تالا کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن اچانک رک گیا۔ کیونکہ اسے

فوراً احساس ہو گیا کہ فلیٹ کا دروازہ مقفل نہیں ہے۔

اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا —؛ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا پھر اس کی نگاہیں پیچھے پلٹ کر بلڈنگ کے مالک خان توقیر کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ لیکن وہاں کسی کو نہ پا کر واپس لوٹ آئیں۔

ایک لمحے کے لئے وارث کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پیدا ہو گئے تھے۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ہی دروازے پر دستک دے دی تھی اور یہ دستک بڑی معزز قسم کی تھی — لیکن جب اندر سے اس معزز دستک کے جواب میں دروازے تک کوئی نہ آیا تو دوسری دستک جارحانہ نوعیت کی تھی۔ اندر سے قدموں کی آواز ابھری اور دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور وارث کے سامنے ایک نہایت ہی خوب صورت عورت کھڑی تھی۔ عمر یہی کوئی تیس پینس کے لگ بھگ تھی۔ سر و قد بڑی بڑی آنکھیں، جو وارث پر جم گئی تھیں۔

”فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ نے؟“

”یہ فلیٹ کس کا ہے؟“ وارث اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”اگر آپ کا تعلق انکم ٹیکس والوں سے ہے تو مالک کا فلیٹ ادھر

کارنڈ پر ہے۔ خان توقیر نام ہے ان کا۔“

”ہیں آپ سے اس فلیٹ کی بات کر رہا ہوں۔“

”اس میں — میں رہتی ہوں —“

”اگر آپ رہتی ہیں تو میں کہاں رہوں گا —؟“ وارث کے لہجے میں  
”تلخی نمایاں تھی۔ اس نے کوٹ کی جیب سے گولڈ لیف کا پکیٹ نکالا اور  
سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لیا — اس سے پہلے کہ وہ سگریٹ کو شعلہ  
دکھاتا، وہ بول پڑی۔

”میں آپ کی بات سمجھی نہیں —“

”میرا نام وارث ہے اور اپنے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا ہوں  
کہ اپنے آپ کو لاوارث محسوس کر رہا ہوں —“

”او تو آپ وارث صاحب ہیں —“ وہ عورت جلدی سے بولی پھر  
راستہ دیتے ہوئے بولی۔

”تشریف لائیے — اندر چل کر گفتگو کر لیتے ہیں —“

وارث نے پھر اسے سر سے پاؤں تک گھورا اور بولا۔

”آپ کون ہیں —؟“

”میرا نام زہرہ جمال ہے۔ خان توقیر کی بہن ہوں اور —“ وہ مزید

کچھ کہتے کہتے رک گئی اور منہس کر بولی۔

”میرا خیال ہے اگر باتیں اندر بیٹھ کر کرنی جائیں تو بہتر نہیں —“

”میں صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ فلیٹ میرا ہی ہے؟“



”ہے تو آپ کا۔“

”اگر میرا ہے تو آپ کیوں یہاں نظر آرہی ہیں۔“ اور میرے فلیٹ کا تالا کیوں کھلا ہوا ہے۔“

”مہی کہانی ہے۔ آپ اندر تو تشریف لائیے۔“

”اتنی لمبی بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ میری عدم موجودگی میں فلیٹ پر قبضہ کر لیا جائے۔ برائے مہربانی آپ فوری طور پر فلیٹ خالی کر دیں۔“ وارث کا لہجہ بڑا اکھڑا ہوا تھا۔

”بھائی جان کہتے تھے کہ آپ بڑے حلیم اور اچھے انسان ہیں۔“

”آپ کے بھائی جان کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ براہ مہربانی۔“

”ٹھیک ہے، میں جارہی ہوں۔ آپ کو آپ کا فلیٹ مبارک۔“

اتنا کہہ کر وہ اندر جانے کی بجائے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ خان توقیر کے فلیٹ کی طرف تھا۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو اس نے پلٹ کر وارث کی طرف دیکھا اور اندر داخل ہو گئی۔

”کیا چکر ہے یہ۔“ وارث بڑبڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وارث

پہلے اپنے بیڈروم میں داخل ہوا تھا۔ اور اپنی ہر شے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ہر شے قریب سے اپنی جگہ پر موجود تھی بلکہ پورا فلیٹ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔ جب وارث دونوں کمروں کا پوری طرح جائزہ

لے چکا تو صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ خاتون توقیر کی بہن زہرہ جمال کے بارے  
سوچنے لگا کہ آیا اس نے میرے فلیٹ کو کیونکر استعمال کیا ہے۔ اور خان  
توقیر نے ایسا کیوں ہونے دیا۔؟

کچھ دیر بعد وہ باتھ میں نہانے کے دوران بھی یہی بات سوچ رہا تھا  
لیکن جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو فارغ ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ صوفے  
کی پشت سے ٹمک کر وہ آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اور اس کی زندگی کے  
ورق جو بارہ سالوں پر محیط تھے، آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔ ماضی کے  
دریچوں سے جہاں روشنی کی چند کرنیں پھوٹی تھیں وہاں اندھیرے کے کچھ  
وجہ بھی ابھرے تھے۔

پندرہ سال قبل جب وہ اپنے مستقبل کے روشن دنوں کی تلاش میں سرگرداں  
تھا۔ جب اس کے دامن میں قدرت نے دو پھول جیسے بچے بھی ڈال  
دیئے تھے ایک بیٹی اور بیٹا خرم۔ اور انا جو اس کی زندگی کے افق  
پر یوں جگمگاٹے تھے کہ وارث کی زندگی کی جدوجہد بڑھ گئی تھی بے روزگاری  
نے گواہی بہت مایوس کر دیا تھا۔ اور گھر کے اخراجات جو کسی لحاظ  
سے بھی پورے نہیں ہو رہے تھے۔ دن بدن اس کا حوصلہ لپٹ کر  
رہے تھے۔ اور جب آہستہ آہستہ حالات ضرورت سے زیادہ خراب  
ہو گئے تو وفادار بیوی اور بھول ایسے بچے کھلا گئے۔ اور جب وہ باپ کی

گردن میں باہیں ڈال کر سکول کے اخراجات کے لئے چند کے مانگے تو  
 وارث اندر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا — اور پھر وہی دن تھے جب  
 اس نے اپنے گھر کو بھوک سے بچانے کے لئے کاسے دھندے میں ہاتھ  
 ڈال دیا — اور یہ کام اس کے ایک دوست نے کیا تھا — جس نے سیرور  
 جیسی لعنت اس کے اندر ڈال دی تھی — بات بھوک سے چلی تھی اور  
 سیرورن کا کام کرنے سے اس کی بھوک مٹ گئی۔ بچوں کو ہر اسٹش پیس  
 ہو گئی۔ حالات بدلتے چلے گئے اور وارث مجرمانہ زندگی میں گردن تک  
 پھنسا چلا گیا — پھر وہ دن بڑا قیامت خیز تھا — بڑا اذیت سے بھرپور  
 تھا — جب اس کی بیوی کو اس کی مجرمانہ زندگی کے بارے علم ہوا تھا۔  
 اور علم اس وقت ہوا تھا جب وارث کو پولیس نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔  
 اسے چھ ماہ کی سزا ہوئی — یہ دن تو آنا ہی تھا۔ جو انسان بڑتا ہے، وہی  
 کاٹتا ہے اور وارث جس نے بھوک کو اس انداز سے مٹایا تھا کہ خود مٹ  
 جانا پڑا — تو یہ دن اس کے لئے دیکھا مقدر تھا۔ جب اس کی بیوی سے  
 سائرہ کو حقیقت حال کا علم ہوا تو محبت کرنے والی بیوی اندر سے ٹوٹ  
 گئی۔ اس نے اپنے شوہر کو آنسوؤں سے بریزہ آنکھوں کے درمیان دیکھا  
 تھا۔ جیسے پورے سمندر کی اداس اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی تھی۔  
 ”یہ کون سا راستہ تھا وارث —“

اور وارث کے پاس، ایک محبت کرنے والے شوہر کے پاس، ایک  
 شفیق باپ کے پاس بیوی کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی جواب نہ تھا۔ اور  
 سائرہ پھر بولی تھی۔ اس کے اندر کرب کا سمندر موجزن تھا۔  
 اندھیروں کا مسافر بننے سے پہلے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ تم تنہا نہیں ہو۔  
 تمہارے ساتھ ایک ایسی عورت بھی ہے جو تمہاری ہمسفر اور محبوب ہے۔  
 بیوی کا ہے۔“

وہ تب بھی کچھ نہ بولا تھا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔  
 وہ پھر بولی تھی اور اس بار اس کے لہجے میں تلخی تھی۔  
 ”خدا حافظ وارث — جب لوٹ کر آؤ — تو میرے گھر کے،  
 دروازے پر دستک ضرور دینا۔“  
 اور تب وارث نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن وہ تو واپس  
 لوٹ چکی تھی۔

وہ پھر چھ ماہ جیل میں رہا تھا۔ اور جیل کی صحبت نے اسے  
 مزید تلخ بنا دیا تھا۔ اسے ہر روز اس بات کا انتظار رہتا کہ سائرہ اس  
 سے ملنے آئے گی۔ لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ اس کے آخری الفاظ  
 اسے جو بیس گھنٹے بے چین کئے رکھتے تھے۔ چھ ماہ کی اذیت ناک زندگی  
 گزر گئی اور وہ دیوانہ وار اپنے گھر کی طرف بھاگا تھا۔ اسے خرم اور

انا کے بارے سوچ نے بے کل کر رکھا تھا۔ وہ دو معصوم بچوں چھوڑ گیا تھا۔ اسے سرویوں کی ٹھنڈک سے بچنے کے لئے اپنی بیوی کی ضرورت تھی۔ پتھر لی زمین پر سوتے سوتے وہ خود بھی پتھر بنا ہو چکا تھا۔ جب اسیری سے رہائی ملی تو وہ دیوانوں کی طرح گھر کی طرف بھاگا۔ لیکن جیسے ہی گھر کے دروازے پر پہنچا اسے سائڑہ کے الفاظ یاد آ گئے۔

”جب لوٹ کر آؤ تو میرے گھر کے دروازے پر دستک ضرور دینا۔“ اور وہ ان الفاظ کی گونج کے درمیان اندر داخل ہوتا ہوتا ٹک گیا۔ یہ الفاظ اس کی بیوی نے کیوں کہے تھے۔؟ وہ چھ ماہ تک یہی سوچتا رہا تھا۔ لیکن جواب تو سائڑہ کے پاس تھا اور وہ جھبکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہی گھر تھا۔ وہی دروازہ تھا۔ وہی مانوس ماحول تھا لیکن فرق صرف یہ پڑا تھا کہ اس کی جھبک نے اسے اجنبی بنا دیا تھا۔ سائڑہ اسے معن میں ملی تھی۔ دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے۔ لیکن پھر کچھ فاصلے پر دونوں رک گئے۔

”بغیر دستک کے آؤ ہو مسافر۔“ سائڑہ کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

”اپنے گھر میں دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی سائڑہ۔“ وارث کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”ہاں، اپنے گھر میں دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ گھر میرا



ہے۔ تمہارا اس وقت محتاج جب تم اس گھر کے مالک تھے اور اس گھر کا مالک۔ جانتے ہو کیا ہوا۔؟“

”کیا ہوا۔؟“

”وہ گزشتہ ہیں جاگرا۔ اس نے روشن مستقبل کے لئے تاریک راستوں کا سفر شروع کر دیا اور اسے شاید نہیں معلوم کہ اس کے دونپے بھی ہیں جو کسی حالت میں بھی ان تاریکیوں کو پسند نہیں کریں گے۔ جو انسان کو وحشی۔ اور اس سے آدمیت کی آخری رتق تک چھین لیتی ہو۔“

وارث کے ہونٹ لرزے۔

”ہیں تمہاری بیوی ہوں۔ تم مجھ سے مل سکتے ہو۔ لیکن ان معصوم بھولوں سے نہیں جو تمہارے اندر سے اٹھنے والی سڑانڈ سے مرجھا جائیں گے۔“

”سائرہ۔؟“ وارث تڑپا۔

”واپس لوٹ جاؤ وارث۔ میں مجرمانہ سیاہی کا سایہ اپنے بچوں پر نہیں پڑنے دینا چاہتی۔“

”سائرہ۔؟“ وارث کے لہجے میں تیزی تھی۔

”نہیں وارث! تم ان کے باپ ضرور ہو۔ لیکن میں تمہیں ان کے قریب بھی نہیں جانے دوں گی۔“

”کچھ میری سنو تو سہی — کیوں صند کر رہی ہو — تم نہیں جانتیں کہ  
کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کر آیا ہوں — پورے چھ ماہ میں نے کس قدر اذیت  
سے گزارے ہیں —“

”تم نے تو گزارے لیکن ہم سے گزر نہ سکے — ہم ہر روز مر مر کر جیے  
ہیں لیکن تم سے شکایت نہیں کر رہے —“

”میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے اور بچوں کے لئے کیا اور میں نے —“  
”پلیز وارث چلے جاؤ — بچے سکول سے آنے والے ہیں، میں نے  
ان سے کہہ دیا ہے کہ تمہارا باپ اندھیروں کا مسافر ہے، جب روشنی اس  
کے اندر بھوٹے گی تو آجائے گا —“

”میں روشنی لے کر آیا ہوں سائبرہ یقین کر دو — اب یہ کام نہیں کروں  
گا۔ میں اپنے بچوں کو حق حلال کی کہا کر کھلاؤں گا —“

اور تب سائبرہ ضبط کا دامن چھوڑ کر وارث کے سینے سے آنگی تھی۔  
اس کے سینے کے اندر جذب ہونے کے انداز میں کس قدر وارفتگی تھی۔  
پھر وارث نے کالا دھندہ چھوڑ دیا تھا — اور گھر کو جنت بنانے  
کے لئے اپنی تعلیمی ڈگری کے دفاتر کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے تھے۔  
لیکن مقدر مسلسل ٹھوکر مار رہا تھا۔ بہت سائبرہ بڑھاتی رہتی تھی لیکن حالات  
سنگین سے سنگین تر ہوتے چلے گئے اور وہ غربت کے ہاتھوں پھر تنگ

آگیا۔ گھر سے پھر غائب رہنے لگا تھا۔ دن بدن مقروض ہوتا جا رہا تھا۔  
 پھر ایک دن جب اسے مقدر کے صفحات کو رے نظر آنے لگے تو  
 وہ اپنے اسی دوست کے پاس چلا گیا۔ اس نے سمجھایا تھا کہ پولیس کی  
 نظروں میں آچکے ہو، ابھی کچھ عرصہ مزید آرام کرو۔ لیکن آرام تب کرتا  
 اگر کچھ کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔ بی۔ اے کی ڈگری کاغذ کا ایک ایسا  
 بے جان ٹکڑا تھا جو اس کا پیٹ نہیں پال رہا تھا۔ لہذا وارث نے پھر  
 دھندہ شروع کر دیا۔ سائبرہ کو اس نے یہی بتایا تھا کہ ملازمت مل گئی  
 ہے لیکن عارضی۔ سائبرہ ایک پیار کرنے والی بیوی تھی۔ وہ ہر وقت  
 اس کا حوصلہ بڑھاتی رہتی تھی۔ ایسے دھندوں میں اکثر بیٹ گھر آنا پڑتا  
 ہے۔ اور وارث بھی آنے لگا تھا۔ تب پھر سائبرہ کو شک ہو گیا۔ لیکن  
 وہ اسے ٹال دیتا۔ لیکن کب تک بات کھل کر سامنے آگئی۔ اس کے  
 پاس آنے والے لوگ اچھے نہیں ہوتے تھے۔ جیسا وہ دھندہ ویسے  
 لوگ۔ اور ایک دن سائبرہ پھٹ پڑی۔

وتم نے وعدہ کیا تھا۔ اپنی سائبرہ سے وعدہ کیا تھا۔ پھر یہ  
 جھوٹا کیوں نکلا۔؟

”عالات۔ مائی ڈیر سائبرہ۔“ وارث نے اسے نرمی سے  
 سمجھانے کی کوشش کی۔

”حالات سے بڑا جاسکتا ہے۔ انہیں اپنی قوتِ ارادی سے شکست دی جاسکتی ہے۔“

”لیکن کب تک، پورے پانچ ماہ بڑا ہوں لیکن تھک گیا۔ ہاں تھک گیا تھا ساثرہ ورنہ یہ دھندہ کبھی نہ کرتا۔ میں یہ کام شوق سے نہیں کرتا۔“

”چھوڑ دو۔ وراثت اس کام کو چھوڑ دو۔ گھر کے گھر بہ باد ہو رہے ہیں تمہارے اس منہوس دھندے سے۔ کس قدر ذلیل نشہ ہے کہ انسان تین چار ماہ بعد قبر میں جاتا رہتا ہے۔ میں نے اس نشے کے بارے کئی بار اخباروں میں پڑھا ہے کہ ایسے لوگ معاشرے کو قتل کر رہے ہیں۔ انسانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ معصوم زندگیوں کو زیرِ پا رہے ہیں۔ تم نے کبھی سوچا کہ صرف تمہاری وجہ سے کتنے گھر بہ باد ہو رہے ہیں۔“

■ لازمت ملتے ہی چھوڑ دوں گا۔“

”ابھی چھوڑ دو۔ کھاڈ میری قسم۔“

”کیا بکو اس ہے۔“ وراثت پہلی بار ساثرہ سے تلخی سے بولا تھا۔ اور ساثرہ اس دن سے خاموش خاموش رہنے لگی تھی۔ اسے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی دم پولیس پہنچنے والی ہے۔ وہ دن بدن فکر اور اندیشوں سے کمزور ہوتی گئی۔ گھر کا سکون بہ باد ہو چکا تھا۔ دونوں ایک

دوسرے سے دور دور رہتے تھے اور ایک دن جھنجھلا کر بولا تھا۔  
 ”آخر تم اس قدر دور کیوں رہتی ہو۔۔۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔ کوئی  
 بھیڑ یا نہیں، جو تمہیں نکل جاوے گا۔۔۔“  
 ”مجھے تم سے سینکڑوں انسانوں کے خون کی بو آتی ہے۔ میں تمہارے  
 قریب نہیں آنا چاہتی۔۔۔“

”نہیں آنا چاہتی تو جہنم میں جاؤ۔۔۔“ وارث دیوانوں کی مانند چیخ پڑا  
 تھا۔ اور پورے پندرہ دن ایک گھر میں رہنے کے بعد جو وہ ایک  
 دوسرے کے سامنے نہیں آئے تھے، پھر سولہویں دن وارث پکڑا گیا۔  
 اسی بار اس نے گھر میں اطلاع نہیں دی تھی۔ اس بار وہ تین سال  
 کے بے چیل گیا تھا۔ تین سال۔ جیسے تین صدیاں بیت گئی ہوں جب  
 جیل سے فارغ ہو کر واپس گھر کی دہلیز پہ آیا تو دشتک دینا نہیں بھولا  
 تھا۔

دروازہ کھولنے والا خرم تھا۔ جو چھ سال کا تھا، جو اپنے باپ کو  
 بغور دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے کس سے ملنا ہے۔۔۔“  
 ”تم سے۔۔۔“ اتنا کہہ کر وارث رو پڑا تھا اور خرم کو سینے سے لگا  
 لیا تھا۔



”مجھ سے — لیکن کیوں —؟“ وہ پریشان ہو گیا تھا۔

”کون ہے خرم بیٹا —؟“ اندر سے ساڑھ کی آواز آئی تھی، اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز وارث نے سُن لی تھی۔ تب وہ خرم کو پیار کر کے اوپر اٹھ کھڑا ہوا — ساڑھ اس کے سامنے کھڑی تھی — اس کی اپنی ساڑھ — اس کی محبوب بیوی۔ دونوں خاموش تھے اور دونوں ایک دوسرے کو پیاسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب تھوڑی بہت پیاس کم ہوئی تو وارث ہنس بولا تھا۔

”اندر آ جاؤں —؟“

”ہاں کیوں نہیں — لیکن بحیثیت مسلمان — پھر تم چلے جاؤ گے۔“  
”یہ کون ہے ممتا —؟“ خرم حیرت سے بولا تھا۔

”تمہارے ابو ہیں بیٹا، جیل سے چھوٹ کر آئے ہیں —“ ساڑھ کے لمبے میں عجیب سی کاٹ تھی — اور وارث بیوی کے تعارف کرانے کا یہ نرالا انداز دیکھ کر جیسے زمین گڑھ گیا — وہ بیٹے کو پیار کرنا چاہتا تھا — لیکن ایسا مجرم بنا تھا — یا پھر اس کی بیوی کے الفاظ نے اُسے ثابت کر دیا تھا کہ وہ دوبارہ بیٹے کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف خشمگین نظروں سے دیکھا — ہزاروں شکوے

تھے، لگے تھے۔ لیکن وہ زبان پر نہیں لاسکتا تھا۔ وہ کہتا چاہتا تھا کہ میرے اعمال بیٹے کے سامنے لارہی ہو۔ مجھے کیوں اس کی نظروں سے گرا رہی ہو۔ لیکن وہ زبان کو حرکت نہ دے سکا۔ زبان اگر خاموش تھی تو نگاہیں بول رہی تھیں۔

اچانک خرم بولا۔

”ممتا! یہ میرے ابو ہیں۔ لیکن جیل کیوں گئے تھے۔“

”آؤ بیٹے! اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔ تمہارے ابو دلہیز پر کھڑے اچھے نہیں لگتے۔“

اتنا کہہ کر سائرہ خرم کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اور وارث جیسے پتھر کا بت بنا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی کہ اندر چلا جائے یا واپس لوٹ جائے۔ لیکن اپنا گھر چھوڑ کر کیسے چلا جاتا۔ اب اسے گھر کی ضرورت تھی۔ وہ پورے تین سال جیل کی پھرتی زمین پر گزار کر آیا تھا۔ لیکن سائرہ جو اس کی بیوی تھی۔ اسے زیادہ دیر برداشت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر اندر چلا آیا۔

وہی بیڈ روم تھا اس کا اپنا اور خوب صورت بیڈ روم جس پر ایک خوب صورت سی گرٹ یا جیسی لڑکی، جو چار سال کی تھی، سو رہی تھی۔

”یہ تمہاری بیٹی انا ہے۔“

”شکر یہ سائڑہ! کہ تم نے مجھے اپنے بچوں سے ملنے دیا۔“ وارث  
کے ہونٹ لرزے تھے، آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے، اس نے سوتی ہوئی  
انا کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور اپنی بیٹی کا خوب صورت چہرہ نگاہوں میں  
بھر کر سائڑہ سے بولا۔

”تو تمہارے خیال میں مجھے اپنے بچوں سے دور چلے جانا چاہیئے۔؟“  
”مجبوری ہے اور نہ ایسا نہ کہتی۔“ وہ رخ پھیر کر بولی اور وارث  
نے اسی لمحے قدموں کو حرکت دی۔ دروازے تک پہنچا۔ پلٹ کر اس نے  
نہم اور انا کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔

”آپ چائے پیئیں گے۔“ دروازے پر کھڑی زہرہ جمال کی آواز  
نے اسے چونکا دیا۔ اور وہ یادوں کے تلخ آئینے سے باہر نکل آیا۔

---

میں ہے مار پیٹے اور تشدد کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔  
 لیکن کچھ لوگ شرانتے کہ زبان نہیں سمجھتے  
 اور مجبوراً انہیں وہ زبان سمجھانا پڑتی ہے۔  
 جس کے وہ عادی ہو رہے ہیں اور یہ وہ مقام  
 ہوتا ہے جہاں اخلاقی قدروں کا مجبوراً ٹوٹنے  
 کرنا پڑتا ہے۔

خوب صورت زہرہ جمال اپنے چہرے پر پینتیس سال کا نکھار لئے اور  
چائے کا کپ تھامے اس کی اجازت کی منتظر تھی۔  
”آئیے، تشریف لائیے۔“ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

زہرہ جمال نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف گرم  
گرم چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے بولی۔

”کیا آپ زور ہے تھے؟“

”شاید۔“ وہ آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ جب ہاتھ گھبرا گیا ہوا  
تو اسے احساس ہوا کہ آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ تلخ  
سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میرے فلیٹ کو میری اجازت  
کے بغیر کیوں کھولا گیا۔“ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے استعمال بھی کیا جاتا



رہا ہو۔“

”تو اس میں یوں رونے والی بات کیا تھی۔۔۔“ وہ حیرت سے اپنی خوب صورت آنکھیں جھپک کر بولی۔

”شاید نہیں تھی۔۔۔“ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

”سال بھر کہاں رہے آپ۔۔۔“

”میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ میرے فیلڈ کو میری اجازت کے بغیر استعمال کرنے کی اجازت کیوں محسوس کی گئی۔۔۔“

”بھائی جان آپ کو مطمئن کریں گے، جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔“

وہ منہ کر بولی اور وارث نے پہلی بار اس کی طرف بغور دیکھا۔

خوب صورت عورت تھی۔۔۔ جسم کا ہر اعضاء بھرا ہوا تھا۔۔۔ قد اور

اور ایک خوب صورت جسم رکھنے والی زہرہ جمال اسے ہر لحاظ سے اور ہر

زادے سے دلفریب اور حسین نظر آئی۔۔۔ خاص طور پر اس کے ہونٹ اور

بڑی بڑی پھیلی سی آنکھیں تو دوسروں کو بہت زیادہ متاثر کرتی تھیں۔

وارث چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

”ٹھیک ہے، میں آپ کے بھائی جان سے بات کر لوں گا۔ اس

چائے کا شکریہ۔۔۔“

وارث نے خالی کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ اتنا عرصہ کہاں رہے —“

”یہ بتانا ضروری ہے کیا —“ وارث نے ایک بار پھر اس کی طرف بغور دیکھا۔

”ضروری تو نہیں البتہ ایک تجسس ہے کہ بھراپڑا گھر چھوڑ کر انسان یوں غائب ہو جائے جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ رہا ہو —“

”شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں — لیکن اس دور کا انسان قناعت پسند نہیں ہے۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں کبھی کبھار تاریک راستوں پر چل نکلتا ہے کہ شاید دوسری طرف روشنی کی کرنیں ہوں — اور یہ کرنیں ایک خوش رنگ پرندے کی مانند ہیں، جس کے تعاقب میں انسان زندگی کا سفر تمام کر بیٹھتا ہے۔“ اتنا کہہ کر وارث نے ایک گہری سانس لی — پھر مزید بولا۔

”میں اپنے فلیٹ کو یوں آپ لوگوں کے استعمال کرنے پر حیران ہوں جبکہ جو کچھ بھی آپ لوگوں نے کیا قطعی غیر قانونی اور غیر اخلاقی تھا —“

”بالکل درست فرمایا آپ نے — لیکن مجبوری تھی اور اگر آپ مجھے اجازت دیں کہ میں بیٹھ جاؤں تو شاید میں بہتر طور پر اپنی مجبوری بتا سکوں۔

ورنہ حرکت تو واقعی غیر اخلاقی اور غیر قانونی تھی۔“

”تشریف رکھیے —“ وارث نے اسے صوفے کی کرسی پر بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔۔۔ نجانے وہ خود بھی کیوں چاہ رہا تھا کہ وہ بیٹھ جائے اور وہ اسے جی بھر کر دیکھے۔۔۔ ہر زاویے سے اور ہر انداز سے۔۔۔ اور یہ خواہش اچانک اٹھی تھی۔۔۔ لیکن وہ اس کا اظہار نہ کر سکا۔۔۔ زہرہ جمال بیٹھ گئی تو وارث نے سگریٹ سلگا لیا اور ایک گہرا کش لے کر استغہامیہ انداز میں اس نے زہرہ جمال کی طرف دیکھا اور وہ اسی لمحے بولی۔

”ہاں تو وارث صاحب! ہم لوگ اپنے جرم کی صفائی یوں پیش کر سکتے ہیں کہ ایک سال قبل جب آپ فلیٹ کو تالا لگا کر گئے تو شاید ایک گھنٹہ بعد آپ کا کمرہ پانی سے بھر گیا۔۔۔ ہماری تو نظر نہیں پڑی البتہ دوسرے فلیٹ والوں نے پانی کمرے سے باہر آتے دیکھا۔۔۔ جب بھائی جان کو اطلاع کی گئی تو میں بھی اتفاق سے ان کے پاس موجود تھی۔۔۔ صورت حال کا جائزہ لیا گیا کیونکہ پانی جس انداز سے باہر آ رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ فلیٹ کے دونوں کمرے باورچی خانہ اور سٹور پانی سے بھر چکا ہے۔ تب ہی پانی باہر نکل آیا ہے۔ صورت حال کافی سنگین تھی۔ لہذا آپ کے کمرے کے قیمتی سامان کو بچانے کے لئے تالا توڑ دیا گیا۔۔۔ اور اندر کی حالت یہ تھی کہ جیسے دریا بہہ رہا ہو۔۔۔ سب سے پہلے نل بند کیا گیا جو آپ کھلا چھوڑ گئے تھے۔ پھر پورا دن پانی کو باہر نکالا جاتا رہا۔۔۔ لیکن جب رات کو بھی آپ کی واپسی نہ ہوئی تو بھائی جان صرف اس خیال

سے کہ اگر نیا تالا لگایا گیا اور آپ دیر سے آئے تو وہ آپ کی چابی سے  
 کھل نہیں سکے گا۔ لہذا وہ آپ کے فلیٹ میں سو گئے تاکہ آپ کو  
 صورتِ حال سے آگاہ کر سکیں۔ لیکن آپ رات بھر نہ آئے۔ لہذا  
 بھائی جان نے مجھ سے کہا کہ سامان خراب ہو رہا ہے۔ کیوں نہ اسے  
 سنبھال دیا جائے۔ لہذا میں پورا دن آپ کے سامان کو خشک کرتی رہی۔  
 رات کو بھائی جان نے آپ کے بارے میں کیا اور میں نے انہیں بتایا کہ  
 گھر کا مالک ابھی تک نہیں آیا۔ لہذا پھر تیسرے دن بھی جب آپ  
 نہ آئے تو دروازے کو نیا تالا لگا دیا گیا۔ اور پھر ظاہری بات ہے کہ  
 چابی کا ہونا یا فلیٹ کی دیکھ بھال کرنا کوئی جرم یا عجیب بات نہیں۔  
 ویسے میں کبھی کبھار جب تنہائی کی ضرورت محسوس کرتی ہوں تو اسے استعمال  
 کر لیتی ہوں۔ اور اس دن اس کی صفائی وغیرہ بھی کر دیتی ہوں۔“  
 اتنا کہہ کر وہ پہلی بار مسکرائی اور بولی۔

”میںرا خیال ہے آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ یا آپ کوئی فردِ جرم  
 سوچ رہے ہیں کہ اس قدر چوکیدارہ کرنے والے لوگوں سے کیا سلوک  
 کیا جائے۔“

”ہیں بہت شرمندہ ہو رہا ہوں اور اپنے رویے پر تادم ہوں۔“ وارث  
 نحیف سا ہو کر بولا۔

”کوئی فردِ جرم —“ ”زہرہ جمال پھر مسکرائی — اور وارث اسی لمحے

بول پڑا۔

”اب اگر آپ نے مزید شرمندہ کرنے کی کوشش کی تو شاید مجھے ہاتھ

جوڑنے پڑ جائیں — ویسے میں اپنی جگہ حق بجانب تھا۔

”اب بھی آپ حق بجانب ہیں —“

”کس بات پر —“

”ہاتھ جوڑنے پر —“ ”زہرہ جمال مسکرا کر اٹھ گئی اور وارث اسے

دیکھتا ہی رہ گیا — کیونکہ وہ یوں اس کی نظروں کے سامنے چلتے ہوئے

باہر نکلی تھی جیسے اس کے پورے وجود سے بجلی بھر رہی ہو۔

”کیا چاہتی ہے یہ مجھ سے —“

یہ ایک اہم سوال تھا جو اچانک وارث کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ وہ

اس کے ذہن میں ایک خلش چھوڑ گئی تھی — وارث اس کے بدن کی خوشبو

کو کمرے میں پھیل ہوا محسوس کر رہا تھا — اور اسی خوشبو کے دوران

اسے ساثرہ یاد آئی — یاد کیا آئی جیسے ماضی کے دریچے سے اس نے

آواز دی ہو — ساثرہ خود بے پناہ خوب صورت عورت تھی اور وارث

نے اسے پیار بھی دل کی گہرائیوں سے کیا تھا — وہ اس وقت اس کے

سامنے کھڑی تھی — وہ اب بھی تصور کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔



”عجب بھی آڈ میرے دروازے پر دستک ضرور دینا۔“ ایک  
چنگاری بھونکی تھی۔

”ہاں اندر آ جاؤ۔“ لیکن ایک مہمان کی حیثیت سے۔ پھر تمہیں  
جانا ہو گا۔ یہ دوسری چنگاری تھی جس نے اس کے اندر زہر بھر دیا تھا۔  
اور وہ چلا آیا تھا۔ اپنے بچوں سے دور۔ پیار کرنے والی سائہ  
سے دور۔ بہت دور۔ اس نے شہر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کالے دھندے  
سے اپنے آپ کو الگ نہ کر سکا۔ اذیت سے بھرپور زندگی لئے وہ رہنمائی  
رہا۔ اور وقت گزرتا چلا گیا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ اس نے جو کچھ  
کیا تھا، بچوں کے لئے کیا تھا۔ سائہ کے لئے اور اسے بھوک سے  
بچانے کے لئے۔ اس کے حسین چہرے کو اور جوانی کو کھلا جانے سے  
بچانے کے لئے سب کچھ کیا تھا۔

پھر سائہ نے اس سے اس قدر نفرت کیوں کی۔ آخر کیوں؟  
اگر نفرت ہی کہتی تو شاید زندگی کا رخ کچھ اور ہوتا۔ لیکن اس نے تو  
اپنے شوہر کی۔ محبوب شوہر کی ذات کی نفی کر دی تھی۔ اور جس انسان  
کی نفی کر دی جائے۔ وہ اندر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر یوں بکھرتا  
ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود پھر اپنے آپ کو مکمل نہیں کر پاتا۔ کیونکہ  
وہ اپنے وجود کے اندر ہی مر جاتا ہے۔ اور وہ بھی مر گیا تھا۔ وہ جو

چوریاں کرتے ہیں، ڈاکے مارتے ہیں، خون کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی انسان رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا تھا۔ شاید وہ یوں گھرنہ چھوڑتا۔ اگر سائبرہ نے اس کے بیٹے سے اسے یوں متعارف نہ کرایا ہوتا کہ۔

”ختم یہ تمہارے ابو ہیں۔ جیل سے چھوٹ کر آئے ہیں۔“  
 کس قدر خطرناک تھا اس کا یہ لہجہ۔ جیسے اولاد کے دلوں میں نفرت کا بیج بونا چاہتی ہو۔ انہیں بتانا چاہتی ہو کہ تمہارا یہ باپ کس قدر قابل نفرت ہے۔ اور سائبرہ کی یہی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب وہ آج تک تلاش نہیں کر سکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وارث اس سے دور ہوتا چلا گیا۔  
 شہر چھوڑنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ جب چودہ سال بعد بیوی اور اولاد کی کوشش نے اسے واپس موڑا تھا تو آتے ہی ایک کیس میں پھنس گیا۔ اس کا وکیل مقدمہ ہار گیا تھا اور وہ سال بھر کے لئے جیل چلا گیا تھا۔ جن لوگوں کے لئے وہ کام کر رہا تھا۔ وارث کے خیال میں انہوں نے اس کا پوری طرح ساتھ نہیں دیا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اسے بچا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے کوشش نہیں کی تھی۔ اور یہی بات وارث

کو ان سے بدظن کر گئی تھی۔ جیل سے فارغ ہوتے ہی اس نے ان لوگوں سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ جب اس نے شیخ امان کے آدمی نکلی کو اپنے لئے جیل کے دروازے پر گاڑی لئے کھڑے دیکھا تو اسے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور ٹیکسی لے کر سیدھا حجاز بلڈنگ چلا آیا تھا۔

اور اب زہرہ جمال اس کے لئے ایک مسئلہ بن رہی تھی۔ جبکہ وہ اپنی زندگی میں اس قسم کا کوئی مسئلہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر جانا چاہتا تھا۔ اپنی بیٹی انا جو، جو ان ہو چکی تھی، اسے ملنا چاہتا تھا۔ اپنے بیٹے خرم کو اپنے کندھے سے اوپر دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اپنی بیوی جس نے عین جوانی میں اپنی ہر خوشی کو تیاگ کر اسے ٹھکرا دیا تھا، اسے دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے جوانی کیسے بتائی۔ گھر جو اس کا اپنا تھا لیکن وہ خود بے گھر ہو گیا تھا۔ اور سائرہ نے کس قدر وثوق سے اس سے کہا تھا کہ جب جیل سے لوٹے تو میرے گھر کے دروازے پر دستک ضرور دینا۔ کس قدر عجیب لہجہ تھا اس کا۔ یعنی گھر کی چار دیواری بھی اس نے چھین لی تھی۔

جب سگریٹ جلتا ہوا فلٹر تک پہنچ کر انگلیوں کو جلانے لگا تو وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔ جیب سے نیا سگریٹ نکال کر اس نے جلانا چاہا تو دروازے میں اس نے زہرہ جمال کو کھڑے پایا۔

”آپ —“

”میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ اگر بھوک محسوس ہو رہی ہو تو کھانا لے

”آؤں —“

”کیا یہ ضروری ہے —؟“

”کھانا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ پیٹ کی آگ اُس سے ہی بجھتی

ہے —“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا —“

”پھر کیا مطلب تھا —؟“

”مے آئے —“ وارث کو مجبوراً کہنا پڑا — اور جب وہ

مسکرا کر چلی گئی تو وارث سوچ میں پڑ گیا — کہ یہ عورت آخر میرے

سر پر کیوں سوار ہو رہی ہے۔ کیا چاہتی ہے مجھ سے —؟

بار بار سامنے آرہی تھی۔

ابھی وہ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر آگئی۔ بڑے میں کھانے

کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ جیسے وہ پہلے ہی کھانا تیار کئے بیٹھی ہو اور

اُسے یقین ہو کہ وہ اُسے کھانا کھلا کر رہنے گی۔

”میرا خیال ہے آپ برتن بڑے ہیں رکھ کر آئی تھیں —“

”جی ہاں! آپ نے درست اندازہ لگایا —“ وہ چھوٹی تپائی پر

برتن رکھتے ہوئے بولی۔

”آخر اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔“

”آپ بہت لمبے سفر سے آئے تھے اور پھر آپ کا فلیٹ استعمال کرتی رہی ہوں، جس سے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اس لئے سوچا کہ اگر ایک وقت کا کھانا ہو جائے تو برائی بھی کیا ہے۔“

”آپ کا جواز معقول ہے۔ لیکن کیونکہ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں اور مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ زیادہ دیر میرے فلیٹ میں ٹھہریں۔ یوں آپ کے کردار پر حرف آئے گا۔“

”حرف آئے گا۔“ وہ آنکھیں چھپک کر بولی۔

”جی ہاں۔“ وارث زور سے بولا۔ پھر مزید بولا۔

”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”جی ہاں۔“ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ

یہ فلیٹ جس میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں ایک سال سے میرے تصرف میں ہے اور پوزیشن یہ ہے کہ دیکھنے والے اور جاننے والے مجھے

اس فلیٹ کی مالک سمجھتے ہیں۔ ہاں البتہ آپ کو دیکھ کر وہ یہی سمجھیں گے کہ آپ میرے رشتے دار یا کزن وغیرہ ہیں۔“

”اور جو لوگ جانتے ہیں کہ میں ایک سال قبل یہاں رہتا تھا۔“

”لوگ ہر بات جلدی بھول جانے کے عادی ہوتے ہیں۔“  
 ”آپ کا مطلب ہے ہر بات۔“ وارث ہر بات پر زور دے کر بولا۔

”ہاں تقریباً ہر بات۔“ حقی کہ وہ حادثہ بھی جو ان پر گزرا ہوتا ہے اور جس حادثے نے انہیں موت کے قریب کر دیا ہوتا ہے۔“  
 ”ہو سکتا ہے آپ درست کہتی ہوں۔ البتہ مجھے اس قدر تجربہ نہیں۔“

”آئیے کھانا کھا بیٹے۔“ وہ سر اپنا میزبان تھی اور اتنی خوبصورت میزبان کے ہاتھوں تو لوگ زہر کھانے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو بات صرف کھانے پر ختم ہو رہی تھی۔ لیکن وارث کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس کی سوچ کا مرکز کچھ اور تھا۔

اچانک وارث نے سر اٹھایا اور بھرپور نگاہ سے زہرہ جمال کی طرف دیکھا اور بولا۔

”آپ نہیں کھائیں گی؟“

”اگر آپ پسند کرتے ہیں تو ساتھ بیٹھ جاتی ہوں۔“  
 ”آپ اچھی میزبان ثابت ہو رہی ہیں۔“ وارث بولا۔

”شکریہ۔“



”بات شکر یے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ حقیقت ہے کہ آپ مجھے اپنے اخلاق سے متاثر ہی نہیں حیران بھی کر رہی ہیں۔“

”پریشان تو نہیں کر رہی۔“ وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کی چلن جھپک کر بولی۔

”شروع شروع میں پریشان ہوا تھا۔ لیکن اب کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“

نہر جمال سنس پڑی۔ موتیوں ایسے دانت وارث کو کسی دوسری دنیا میں لے گئے۔ لیکن اُس نے جلدی سے سر جھکا کر اپنی توجہ کھانے کی طرف مبذول کر لی۔ وہ ساتھ بیٹھی چھوٹے چھوٹے لقمے نگل رہی تھی۔ اور وارث کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے قریب ملنے چلے آئے ہوں۔

”گوشت کیسا بنا ہے۔“ وہ اچانک پوچھ بیٹھی۔

”بہت ہی لذیذ۔ بہت ہی مزے دار۔“

”شکریہ۔“ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ جیسے اُسے یقین تھا کہ

وارث سالن کی تعریف ضرور کرے گا

پھر دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے، اور یوں کھانا اختتام کو پہنچ گیا۔

”اب شاید چائے پیئیں گے آپ۔“  
 ”آپ کو کیسے معلوم تھا کہ۔۔۔“ وارث جملہ ادھورا جھوڑ کر  
 خاموش ہو گیا۔

”نوٹے فیصد انسان کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے ہیں۔“  
 وہ برتن میٹتے ہوئے بولی۔

”بہر کیف شرمندہ ہوں کہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔“  
 ”ایسی بات کہہ کر آپ میرے خلوص کی توہین کر رہے ہیں۔“  
 وہ ٹرے میں برتن رکھتے ہوئے بولی۔

وارث کھیانہ سا ہو گیا اور وہ ٹرے لٹے باہر نکل گئی اور وارث کی  
 نظریں خالی دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ جہاں سے چند لمحے پہلے نہرہ جمال  
 کا سراپا سرسراتا ہوا گذرا تھا۔ جیسے معطر معطر ہوا اپنی بے رنگ سی،  
 بے نام سی خوشبو کا احساس دلا جائے۔

دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑا تھا۔ دروازے سے اندر داخل  
 ہونے والا چہرہ اتنا اچھا نہیں تھا کہ وہ خوش ہو تار یا اس کا گرجوٹی سے  
 استقبال کرتا۔

”تم ادھر یہاں۔۔۔“ وارث کے حلق سے غراہٹ سی نکلی تھی۔  
 ”باس نے سلام بھیجا ہے۔ مگر وارث کافی دیر سے منتظر تھا۔ لیکن

آپ کچھ زیادہ ہی مصروف تھے۔ اس لئے باہر انتظار کرتا رہا۔  
آنے والا عجیب سے پیچھے میں بولا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس کی  
طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

”تم جبار ہو، نا۔“

”تم نے ٹھیک پہچانا۔ اور پھر میں کوئی بھولنے والی شے  
نہیں ہوں۔“ وہ خباثت سے مسکرایا۔

وارث آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا۔ پھر اس نے بڑی  
آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ اور جبار کو گھورتا ہوا بولا۔

”سٹر جبار میں تمہارے پاس کے لئے ایک تحفہ بھیجنا چاہتا ہوں۔  
اور تم سے اچھا اور خوبصورت تحفہ شاید اور نہ ملے۔“ وارث خطرناک  
تیوروں کے درمیان بولا۔

”کیا مطلب۔؟ جبار ایک دم محتاط ہو گیا۔

”جیل کے باہر میں نے نیکی سے کہا تھا کہ اپنے گرو گھنٹال سے کہہ

دینا کہ وارث اس قدر لاوارث نہیں ہے۔ لیکن شاید میری بات

اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لہذا اب دوسری زبان میں سمجھاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر وارث نے پوری قوت سے جبار کے منہ پر ہاتھ دے

مارا۔ گو جبار اس قسم کے غیر متوقع حملے کے لئے اپنے آپ کو تیار

کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود دھوکہ کھا گیا۔ وارث کا ہاتھ بڑا  
 زبردار تھا۔ پھر اس نے پہلے کہ جبار سنبھلتا، دوسرا ہاتھ اس کی  
 گردن پر پڑا تھا۔ جس سے جبار لڑکھڑا گیا۔ تیسرا ہاتھ اس کے ہونٹوں  
 پر سیدھا جا لگا تھا۔ اور جبار کراہ کر اس تپائی پر جا پڑا، جہاں کچھ  
 دیر پہلے وہ زہرہ جمال کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ جبار کے ہونٹوں  
 سے گالیوں کا طوفان اُڑ پڑا تھا۔

”یہ تمام گالیاں بچا کر لے جاؤ جبار اور اپنے باس کو دے دینا“  
 وارث اس کی گردن پر دوبارہ بوٹ رکھ کر غرایا اور پھر مزید بولا۔  
 ”مٹر جبار۔۔۔! میں عمر کی جس اسٹیج پر ہوں، وہاں حاکمیت  
 برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میرے کچھ اپنے اصول ہیں۔ واپس جا کر  
 شیخ امان اللہ سے کہہ دینا کہ آئندہ ادھر کسی آدمی کو نہ بھیجے۔ اگر بعد میں  
 اس نے اپنے ہی آدمی کو پہچاننے سے انکار کر دیا تو اس میں میرا  
 کوئی قصور نہیں ہوگا۔“ اتنا کہہ کر وارث نے جبار کی گردن پر مزید  
 دھاؤ ڈالا اور بولا۔

”اور اسے یہ بھی کہہ دینا کہ میں بھی بانٹ کر کھانے کا عادی ہوں۔  
 جو ساتھی دوسرے ساتھی کی تکلیف اور دکھ درد کی سانجھ نہ جانتا ہو،  
 میں اس کے ساتھ کام نہیں کیا کرتا۔“ اتنا کہہ کر وارث نے

پوری قوت سے اُسے ٹھوکر ماری جس پر جبار غش کھاتے کھاتے رہ گیا۔

”اب تم جا سکتے ہو مشر جبار۔! اور امید ہے کہ تم اور تمہارا باس اس زبان کو سمجھ جائے گا۔“

جبار کراہتا ہوا اٹھا اور ہونٹوں سے خون صاف کرتے ہوئے بولا۔  
 ”میں تم سے جھگڑا کرنے نہیں آیا تھا۔ صرف باس کا پیغام دینا تھا۔  
 اور تم نے یہ سب کچھ اچھا نہیں کیا وارث۔“

”شکر یہ! مشر جبار تمہارے پیغام کا۔ یہ سزا جو تمہیں میں نے دی ہے یہ بغیر اجازت فلیٹ میں داخل ہونے پر تھی۔“

جبار نے منہ کا خون وہی تھوک دیا۔ جس پر وارث نے پھر اُسے تھپڑ دے مارا۔ اور غرا کر بولا۔

”یہ میرا گھر ہے اور گھر میں کسی قسم کی گندگی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔“

اور جبار جو بڑی طرح زخمی ہو چکا تھا وارث کو کینہ تو ز نظروں سے گھورتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر جب باہر نکلا تو دیوار کے ساتھ کھڑی زہیرہ جمال کی طرف گھور کر دیکھا۔ پھر تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

زہرہ جمال جو اندر بند کمرے میں ہونے والی شوٹنگ اپنے کانوں سے سن چکی تھی۔ پریشانی کی حالت میں وہیں کھڑی رہی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی اور اُس ٹرے میں چائے کے برتن موجود تھے۔ چند لمحوں تک وہ وہیں ساکت کھڑی رہی۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو لا پر واثا بت کرنے کی کوشش کی تھی۔ جیسے وہ کچھ بھی نہیں جانتی کہ کچھ دیر قبل اندر کیا ہوتا رہا ہے۔

”میں بہت تکلیف دے رہا ہوں آپ کو۔“ وارث نے اُسے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔

”تکلیف میں تو آپ کا بہانہ کیا ہے۔ اور میں ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ ہوں۔“

وارث ایک لمحے کے لئے پریشان ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

”دوست تھا۔ اور بغیر اجازت اندر گھس آیا تھا۔“

”اور آپ اس قدر بے تکلفی پسند نہیں کرتے۔“ زہرہ جمال ابھی ابھی نظروں سے وارث کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہونا بھی نہیں چاہیے۔ کیا آپ کسی ایسے انسان کو برداشت



کریں گی۔ جسے آپ پسند بھی نہ کرتی ہوں اور وہ اس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ بھی کر بیٹھے۔ لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ دوست تھا، اور دوست انہیں کہا جاتا ہے جو پسند ہوں۔ شاید میں لفظ دوست غلط استعمال کر گیا تھا۔ مجھے جاننے والا کہنا چاہیے تھا۔۔۔

زہرہ کچھ نہ بولی۔ اس نے اُلٹی ہوئی تپائی کو سیدھا کیا اور اس پر برتن رکھ دیا۔ کپ میں چلتے دھاتے اس خون کی طرف دیکھنے لگی۔ جو جہاز کے منہ سے نکل کر فرش پر بڑا سا داغ دے گیا تھا۔

”کتنی چینی لیس گئے۔۔۔؟“

”ایک چم۔۔۔“ وارث اس کی پشت پر نظریں جمائے جمائے بولا۔ کیونکہ وہ صاف طور پر کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ زہرہ جمال فرش پر گرے ہوئے خون کو دیکھ رہی ہے۔

وہ چائے کا کپ لئے سیدھی ہوئی اور وارث کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”آپ مارپیٹ اور تشدد کو پسند کرتے ہیں شاید۔۔۔“

”اتنا بھی نہیں جتنا آپ اثر قبول کر رہی ہیں۔ ہاں اگر ضرورت محسوس ہو اور اس کے بغیر کام نہ نکلتا ہو تو مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے اور پھر اس معاشرے میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف یہی زبان ہے

سمجھتے ہیں۔ انہیں اور کوئی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔“  
 ”یہ فرش صاف کر دوں۔“ زہرہ جمال عجیب سے انداز  
 سے وارث کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ چائے پیجئے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ دوسرا کپ بھی ساتھ  
 لائی ہیں۔ لیکن فرشی خون میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔“

”دوسرا کپ میں آپ کے ہمان کے لئے لائی تھی۔ کیونکہ میں نے  
 اُسے آپ کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو زحمت ہوئی۔ اب اگر آپ پسند  
 کریں تو خود وہ کپ استعمال کر لیں۔“ وارث خفیف ہو کر بولا۔

زہرہ نے خاموشی سے اپنے لئے کپ بنایا اور اپنی سابقہ کرسی  
 پر جا بیٹھی۔ پھر چائے کا گھونٹ بھرتی ہوئی بولی۔

”آپ ایک سال کہاں رہے۔“

”یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“ وارث زیر لب مسکرا کر بولا۔  
 ”ایسے ہی اپنے تجسس کے لئے۔“

”کوئی اچھی جگہ نہیں تھی۔“

”مثلاً۔“ زہرہ جمال چائے کی چسکی لیتے ہوئے آہستہ سے

بولی۔

”اب کیا عرض کروں۔۔۔“ وارث محتاط تھا۔

”جیل۔۔۔“ زہرہ دھماکے کرنے والے انداز میں بولی۔ اور وارث کے ہاتھ سے کپ چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔“

زہرہ جمال نے پہلی مرتبہ وارث کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا پھر خود بھی محتاط انداز میں بولی۔

”بُری جگہ تو انسان کے لئے وہی ہو سکتی ہے۔۔۔“

”وارث بے دلی سے مسکرا دیا۔ اور بولا۔

”کافی عرصے بعد اچھی چائے نصیب ہوئی ہے۔۔۔“

”جہاں سے آپ آئے ہیں وہاں چائے کا تو شاید نام ہی ہوتا

ہوگا۔۔۔“

”شاید آپ درست کہہ رہی ہیں۔۔۔“ وارث تلملا کر بولا۔

اُسے اب چائے ہی نہیں زہرہ جمال بھی زہرے لگنے لگی تھی۔ اس نے

جلدی جلدی چائے ختم کی اور اٹھتا ہوا بولا۔۔۔

”اگر آپ کا کچھ سامان یہاں ہو۔۔۔ جیسا کہ میں دیکھ رہا ہوں

کہ کافی سامان ہے، اُسے لے جائیں تو بہتر ہے۔ میں واپسی پر جا بی

خان توقیر کے ہاں سے آواز دے کر لے لوں گا۔۔۔“ اتنا کہہ کر

وارث تیزی سے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر جیسے ہی  
 وہ باہر نکلا زہرہ جمال کے ہونٹ سکڑے سے لگے۔ وہ بہت کچھ سوچ  
 رہی تھی۔ اور کافی دیر تک وہیں ساکت بیٹھی رہی۔ پھر جب اٹھی تو  
 اس کے ہونٹوں سے کراہ سی نکلی تھی — بڑی عجیب سی کراہ تھی  
 جیسے کوئی سپنا ٹوٹا ہو — جیسے کسی حسین خیال میں زہر بھر گیا ہو۔  
 یا پھر جیسے کسی خوش رنگ ہنسنے والے بھول کو چھوٹے وقت کا ٹٹا  
 چبھ گیا ہو اور خون انگلی کی بجائے دل سے نکل پڑا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ  
 اپنے سامان کی طرف بڑھ رہی تھی جو اس نے وہاں رکھ چھوڑا تھا۔

---

ہمارے ملک بڑے خوددار  
ہے جناب! اگر وہ بہادر ملک پر زندہ  
رہنے کے عادی ہوئے تو آج ہمارے  
گھر کے یہ حالت نہ ہوتی کہ گھر آئے  
ہوئے مہمان کے لئے پڑوس سے  
دودھ پیتے مانگتے۔ یہ مفلس ہمیشہ عزیز  
ہے۔ اس دولت سے بہتر ہے جس سے  
انسانی کردار دلہے میں سڑاؤ اٹھنا  
شروع ہو جاتا ہے۔

اسے کے قدم گو جانی پہچانی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن  
نجانے کیوں اُسے اُس منزل کے تمام راستے اجنبی اور اندھے  
اندھے لگ رہے تھے۔

پندرہ سال — جو ایک غیر معمولی مدت تھی۔ جو عمر کا ایک جوان  
اور حسین حصہ تھا۔ گنوا کر وہ واپس لوٹا تھا۔ اپنی سائیرہ کے پاس  
جو اس کی ہم راز تھی، دوست تھی، محبوب تھی، لیکن اس کے باوجود  
وہ اجنبی تھا۔ وہ پندرہ سال بعد اُس دروازے پر بارہا تھا جو اس کا  
اپنا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دستک دینا پڑتی تھی۔

نہیں وہ سائیرہ کو نہیں — شاید اپنی بیٹی انا اور بیٹے خرم کو  
دیکھنے آیا تھا، جو جوان ہو چکے تھے۔ نجانے سائیرہ نے انہیں باپ  
کے بارے میں کیا بتایا تھا کہ وہ کون ہے، کون تھا — کیسا تھا۔



اور کیا کرتا تھا۔

کیا اس نے ایک باپ کے کردار کو بچوں کی نظروں میں مسخ کر دیا تھا۔ کیا اس نے بچوں کے ذہنوں میں باپ کی طرف سے زہر بھر دیا تھا۔ اور ایک مقدس رشتے کو داغدار کر دیا تھا ؟

یہ سب خیالات تھے جو وارث کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ لیکن ان کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وقت کے پاس تھا اور وقت اسے پندرہ سال بعد کیا دینے والا ہے، وہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ اپنے اندر کی خلش اور جھین ضرور دور کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ اسے چین نہ آتا۔ بے چین رہتا۔ زندگی کا پیہر جام ہو کر رہ جاتا۔ جانی پیچانی جگہ پر اترتا تھا۔ اس نے سامنے نگاہ دوڑائی تھی، جہاں اس کا آشیانہ تھا۔ اپنا آشیانہ جو پندرہ سال پہلے جل گیا تھا۔ اور اسے جلانے والا کون تھا۔؟ ساڑھ یا وہ خود۔؟

یہ ایک سوال تھا جسے وہ اب تک نہ سمجھ سکا تھا۔

جب وہ دروازے کے سامنے رکا تو اس کا دل سینے کی بجائے پورے وجود کی دھڑکن بن گیا تھا۔ سینکڑوں قسم کے خیالات اور دوسو سوں نے اسے ڈنگ مارا تھا۔ ایک تیز آندھی نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا تھا۔ اور پھر لرزے کا پتے وجود کو دیوار کا سہارا دیئے اس نے ہاتھ دتک کے

لئے اٹھا دیا تھا۔ اندر سے قدموں کی آواز ابھری تھی اور کچھ دیر بعد جب دروازہ کھلا تو ایک خوب صورت سی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ بڑی سادہ اور بہت ہی خوب صورت، اپنی مال کی طرح سرخ و سفید چہرے پر ایک وقار اور جلال لئے۔ یہ اتنا تھی۔ اس کی اپنی بیٹی، اپنا خون جو استفہامیہ انداز میں اپنے باپ کی طرف دیکھے جا رہی تھی، اس احساس کے بغیر کہ سامنے کون کھڑا ہے۔۔۔

”فرمائیے! کس سے ملنا ہے آپ کو۔“  
 ”ات۔۔۔ تمہارا نام انا ہے نا۔“ وارث کے ہونٹ لرزے۔  
 ”جج۔۔۔ جی ہاں لیکن آپ کون ہیں اور۔۔۔“ انا جملہ ادھر اچھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔

”میں نے تم بہن بھائی کو چھوٹا سا دیکھا تھا“ اور۔۔۔“ وارث مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”آپ کون ہیں۔۔۔ اور ہمیں کیسے جانتے ہیں۔۔۔“

”خرم کہاں ہے۔۔۔ کیا گھر میں ہے۔۔۔“

”خرم بھائی گھر میں نہیں ہیں، لیکن آپ۔۔۔“

”میں ان سے ملنا چاہتا ہوں بیٹی۔“

”کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں آپ انہیں۔“ انا کے لہجے میں  
اب بھی الجھن نمایاں تھی۔

وارث جو بڑی وارفتگی کے عالم میں بیٹی کو دیکھ رہا تھا اور سندر سے  
چہرے کو اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔ آہستہ سے بولا۔

”اس سے کچھ کام تھا۔“

”کیا کام تھا آپ کو۔“

”یہی جو تم سے ہے۔“ وارث کا لہجہ ترسا ہوا اور پیاسا تھا۔

”کیا مطلب۔“

”بیٹی! تم ہمیں پہچان نہیں رہیں۔ شاید تمہیں یہ بھی یاد نہ ہو کہ  
تمہاری اس خوب صورت پیشانی پر بھی ہم نے بڑی شفقت سے اور عقیدت  
سے بوسہ دیا تھا۔ اور اس وقت تم بہت چھوٹی سی تھیں۔ تمہیں کہاں  
یاد ہوگا۔“

”میں یہی آپ سے معلوم کر رہی ہوں کہ آپ کون ہیں اور کیا  
چاہتے ہیں۔“ انا کا لہجہ اس بار بڑا عجیب سا تھا۔ اس کے لہجے میں  
کاٹ سی تھی جسے وارث نے بھی محسوس کر لیا۔ لہذا وہ ترستی اور ٹپتی  
ہوئی نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”جاؤ بیٹی! اپنی مال سے کہو کہ کوئی جہان آیا ہے۔“

”امنی غیر مردوں سے نہیں ملا کرتیں۔“ انا تلخ سے انداز میں دلہن کو گھورتے ہوئے بولی۔

”میں اتنا غیر بھی نہیں ہوں کہ مجھے پہچان نہ سکیں۔ وہ مجھے جانتی ہیں بیٹے۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری امی کو مجھے پہچاننے میں دقت نہیں ہوگی۔“

وارث کی آواز میں تڑپ تھی۔ پندرہ سالہ جدائی اور دوری کا لاوا تھا جو کرب اور اذیت کی صورت میں اس کے چہرے کے نقوش پر چھا گیا تھا۔

”وہ شاید آپ کو نہ پہچان سکیں کیونکہ ان کی نظر کافی کمزور ہو چکی ہے اور یہ قسمتی یہ ہے کہ ان کی عینک کا ایک شیشہ پرسوں لوٹ گیا تھا جسے خرم بھائی ابھی تک نہیں بنوا سکے۔ لہذا مجھے امید ہے کہ اگر آپ کو جانتی بھی ہوئیں تو شاید عینک کے بغیر آپ کو نہ پہچان سکیں۔“ انا نے تفصیل سے وضاحت پیش کی۔

وارث ساڑھ کے بارے یہ سن کر کہ اس کی نظر ضرورت سے زیادہ کمزور ہو چکی ہے اور وہ عینک کے بغیر چہرے نہیں پہچان سکتی، بے سپاہ دکھ ہوا۔ چند لمحوں تک وہ ساکت کھڑا رہا۔ پھر اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے امید ہے کہ وہ مجھے آواز سے پہچان سکیں گی۔“

”کون ہے بیٹی! کس سے باتیں کر رہی ہو۔“ اندر سے سائرہ کی آواز اُبھری جسے سننے کے لئے وارث کے کان ترس گئے تھے۔ وارث نے بے قابو ہو کر آگے بڑھنا چاہا۔ لیکن پھر اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا کیونکہ انا اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

”کوئی اجنبی مہمان ہے آپ کو جانتا ہے اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہے۔ کہتا ہے آپ اسے جانتی ہیں۔“

”نام پوچھو بیٹی کون ہے۔“

”کہہ دو بیٹی! مسافروں تاریک راستوں کا۔“ پہلے بھی مہمان بن کر ایک بار آچکا ہوں۔“ وارث نے یہ الفاظ کافی بلند آواز سے کہے تھے جو یقیناً سائرہ نے سن لئے تھے۔ کیونکہ اندر ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ انا کبھی ماں کی طرف دیکھ لیتی تھی جو اندر دروازے کا سہارا لئے کھڑی تھی اور گم صم تھی۔ اور کبھی اجنبی مہمان کی طرف جو دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اچانک انا بولی۔

”اتنی! کیا کہوں انہیں۔“

”اندر سے آؤ بیٹی! شاید کوئی پرانی جان پہچان والا ہے۔“ سائرہ

کی آواز میں ہلکی سی ہنسنے کی موجود تھی، جو انا نے بھی محسوس کر لی۔

”آئیے! تشریف لائیے، امی نے اجازت دے دی ہے۔“ انا وارث کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ اور وارث بیٹی کی نگاہوں کی چھین کو دل پر محسوس کرتے ہوئے، لرزتے وجود کے ساتھ اپنے گھر کی دلیز عبور کر گیا۔

انا نے دیکھا کہ اس کی ماں دروازہ چھوڑ کر اندر چلی گئی ہے۔ جب وہ اجنبی کو لے کر اندر پہنچی تو وہ صوفے پر بیٹھنی ہوئی تھی اور انا نے پہلی بار اپنی ماں کے چہرے پر وجاہت دیکھی۔ تنہی ہوئی گردن، سیاٹ چہرہ جو اپنے اندر وقار اور تمکنت لئے ہوئے تھا۔

”مہمان کے لئے چائے بنا لاؤ بیٹی۔“ سائرہ نے انا کو ٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ وارث کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

”آپ پہچانتی ہیں امی انہیں، یہ کون ہیں؟“ انا بول پڑی۔  
 ”چہرہ تو دھندلا دھندلا سا ہے لیکن آواز جانی پہچانی ہے۔ بیٹی اجاؤ تم چائے بنا لاؤ۔“

”لیکن امی آپ۔“ انا نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ سائرہ ہاتھ اٹھا کر بڑی رعوت سے بولی۔

”جاؤ انا جو کہا ہے، وہی کرو۔“

انا نے پریشان کن نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ پھر ماں کی طرف



اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی ماں کو آج تک اس قدر تلخ لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو بڑی شفیق اور مہربان ماں تھی۔ جس نے اپنی ساری عمر اپنی اولاد کے مستقبل پر قربان کر دی تھی۔ جو اپنا خون مہین کو پلا پلا کر اولاد کے مستقبل کو سنوارتی رہی۔ آج اسی ماں نے اسے ایک اجنبی کے لئے ڈانٹ دیا تھا۔ وہ پریشان ذہن لئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اب بدلتوں کے بچھڑے دوسا تھی ایک دوسرے کے سامنے تھے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ لمحے، کچھ ساعتیں اور کچھ گھڑیاں دونوں کے درمیان سے بڑی خاموشی سے گزر گئیں۔

”بیٹھ جاؤ، کھڑے کیوں ہو۔“ اچانک سائرہ کے ہونٹ لرزے۔

”شکریہ سائرہ۔“

”نام مت لو میرا۔“ بچی شک کر جائے گی ماں کے کردار پر۔

سائرہ کی سرگوشی شدت جذبات سے لرزی۔

”کیسی ہو۔“ وارث کا دل رو پڑا۔ کس قدر خوب صورت چہرہ تھا جو جوانی میں بڑھاپے اور رند ٹھاپے کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

”جیسی بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔“ سائرہ کی آواز کانپ گئی تھی۔

”کیسے کاٹی ہے زندگی۔“

”آنکھوں والے ہو غور سے دیکھو۔ گزرے ہوئے سنگدل ایام  
کے نقش میرے چہرے پر عیاں ہیں اور۔۔۔ اور یہ بھی غور سے دیکھو کہ  
اس چہرے پر کوئی داغ تو نہیں ہے۔“  
”نہیں میری سائہ پر کوئی داغ نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ کوئی داغ  
ہو ہی نہیں سکتا۔“ وارث کی آواز شدت جذبات سے لہزہ لہنہ  
گئی تھی۔

سائہ نے ایک گہری سانس لی اور مدھم آواز میں بولی۔  
”اس اعتماد اور اعزاز کا شکریہ وارث۔۔۔“  
”ایک بار پھر وارث کہو۔۔۔“ وارث رو پڑا۔  
”اقبلی تپتی نہیں ہے۔۔۔“ باہر دور سے انا کی آواز پڑی۔  
”پڑوس سے مانگ لو بیٹی۔!“ سائہ اپنی آواز کی لرزش کو چھپانے  
کے لئے چیخ کر بولی۔

پھر باہر سے آواز نہ ابھری جب سناٹا چھا گیا تو سائہ پھر بولی۔  
”اپنی بیٹی کو دیکھا۔ کس قدر جوان ہو گئی ہے۔“  
”ہاں دیکھا، بہت ہی خوب صورت۔ بہت ہی پیاری، ہو بہو اپنی  
مال کی تصویر ہے۔“

”بی۔ اے میں پہلا سال ہے اس کا — بڑی حساس اور محنتی لڑکی ہے  
اس بار سائڑہ کے لمبے میں فخر تھا۔“

”یہ تمہاری تربیت اور دودھ کا اثر ہے —“

سائڑہ کچھ نہ بولی — وہ مسلسل وارث کی طرف دیکھ رہی تھی، اور  
وارث جو خود اسے دیکھے جا رہا تھا مدھم سی آواز میں بولا۔

”کیا تمہیں میری صورت صاف نظر آرہی ہے —“

”ہاں کیوں نہیں — آنکھوں کی روشنی کم ہے تو کیا ہوا، دل کے  
آنکھیں تو روشن ہیں —“

”نظر اس قدر کمزور کیوں ہو گئی —؟“

”محلے والوں کے کپڑے سلائی کرتے کرتے تھک سی گئی ہوں —“

”مم — میں تمہارا مجرم ہوں — کیا مجھے معاف نہیں کر سکتیں —؟“

وارث ترپا — اس سے پہلے کہ سائڑہ کو فی جواب دیتی کمرے کی طرف

بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز نے دونوں کو محتاط کر دیا — وارث نے

جلدی سے آنکھیں خشک کر لیں — آنے والی آنا تھی جو دروازے کے اندر

نہیں آئی تھی، وہیں کھڑے کھڑے بولی۔

”اتنی جان! اگر دودھ اور پتی ایک سانڈ پڑوس سے مانگا جائے تو وہ

صنود پوچھیں گے کہ آنے والا کہاں، ن قدر اہم کیوں ہے —؟“

وارث بیٹی کے اس قدر تلخ سوال پہ بوکھلا گیا اور ہڑبڑا کر بولا۔

”پچائے رہنے دو بیٹی مجھے ضرورت بھی نہیں۔“

”ہاں، یہ ذرا جلدی میں ہیں۔ پھر کبھی پی لیں گے۔ تم مہمان کو

دروازے تک چھوڑ آؤ۔ یوں مہمان کی عزت بڑ جائے گی۔“

”شکریہ۔ آپ واقعی بہت عظیم خاتون ہیں۔ اور میں آپ کی عظمت

کو سلام کرتا ہوں۔“ وارث اتنا کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نظر بھر

کر اس نے سائہ کی طرف دیکھا اور باہر نکل آیا۔ انا اسے دروازے

تک چھوڑنے آئی لیکن وہ دروازے پر رک گیا تھا اور انا کی طرف دیکھتے

ہوئے بولا۔

”اگر تم اجازت دو تو تمہارے سر پہ ہاتھ رکھ کر نصرت ہو لوں۔“

”اس کی ضرورت تو نہیں۔ کیونکہ جس نے ہاتھ رکھنا تھا، وہ ہی

نہیں رہا۔ بہر کیف آپ رکھ لیجئے۔“

”شکریہ بیٹی۔“ وارث نے شفقت سے انا کے سر پہ ہاتھ رکھا اس

کا ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔

”پھر بھی کبھی آئے گا۔“

”ضرور آؤں گا بیٹی! ضرور آؤں گا۔ اگر چائے پلانے کا وعدہ کرو۔“

”گھر میں دودھ پتی اور چینی موجود ہو تو چائے بنانے میں کوئی

اعتراض نہیں —

وارث نے تیار ہو جانے والی نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھا، پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”خرم بیٹا پڑھ رہا ہے کیا؟“

”جی نہیں،“ انہوں نے بی۔ اے کر لیا ہے۔ آج کل وہ ملازمت کی

تلاش میں ہیں — اور مجھے امید ہے جب ان کو ملازمت مل گئی تو پھر گھر

میں آئے ہوئے مہال کے لئے دودھ پتی لینے پڑوس نہیں جانا پڑے گا۔

”شرمندہ نہ رہی ہو بیٹی —“

”سچ بونا مال نے سکھا دیا ہے۔ اس لئے اپنی پوزیشن بتاتے ہوئے

شرم محسوس نہیں ہوتی —“

”اگر میں کچھ مالی مدد کرنا چاہوں تو قبول کر لو گی بیٹی —؟“

”میری امی اگر سہارے لے کر زندہ رہنے کی کوشش کرتیں تو آج ہم

لوگ اس قدر مفلس نہ ہوتے کہ گھر آئے ہوئے مہمان کو چائے تک نہ

پلا سکتے — میری مال بہت خود دار ہے جناب — اس نے اپنا خون

بیچ بیچ کر ہمیں جو ان کیا ہے — ان کا سارا خون سلائی مشین پی گئی۔ بہر

کیف مجھے افسوس ہے کہ آپ کی آفر قبول نہیں کر سکتی — البتہ اپنی مخلصانہ

آفراتی کے سامنے پیش کیجئے گا۔ ہو سکتا ہے پرانے تعلقات کی وجہ سے

قبول کر لیں — خدا حافظ — ! اتنا کہہ کر وہ بڑی تیزی سے پٹی بٹھی۔  
 اور وارث کو ذہنی جھٹکا دے کر رزتا کا پتا چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔  
 ”اُف میرے خدا — یہ لڑکی کیا کہہ گئی ہے —“ وارث وہیں دیوار  
 کا سہارا لے کر کھڑا رہ گیا۔ جیسے وہیں زمین میں نصب ہو گیا ہو۔ صاف  
 ظاہر تھا کہ وہ ماں کے کردار پر شک کر گئی تھی — آخر کیوں نہ کرتی۔ بقول  
 اس کے کہ اس نے اپنی تمام عمر کسی غیر مرد کو ماں سے ملتے نہیں دیکھا تھا۔  
 اور آج اس کی ماں نے جنس انداز سے اسے جھڑک دیا تھا۔ وہ اس  
 بات کی علامت تھی کہ جان پہچان پرانی ہے — اتنا کاشک کرنا بجا ہے۔  
 وارث اپنے آپ کو گھیسٹے ہوئے اس مکان سے اپنے آپ کو دور  
 بے گیا جو اس کا اپنا آشیانہ تھا۔ اس کا ذہن گھر کی مفلسی دیکھ کر،  
 پٹی اور بیوی سے مل کر جل اٹھا تھا۔ جہاں تڑپتے دل کو سکون ملا تھا  
 وہاں کچھ چنگاریاں بھی اندر بھر گئی تھیں — اور وہ ان چنگاریوں کے  
 پیش اپنے وجود میں محسوس کر رہا تھا۔





مال ہے صرف مال ہے ہوتے ہیں انا۔ اُسے  
 پر کبھی شک ہے مہتے کرتا۔ شک ہے محبت اور  
 عظمت کو کھا جاتا ہے۔ ہم ہیں دونوں اُسے  
 کا کٹے سرمایہ ہیں۔ اور کٹے اثاثہ ہیں۔  
 ہم ہیں اُسے کے وجود میں حرارت ہے۔  
 اور ہماری وجہ ہیں اُسے کے سانپوں  
 کے آمدورفت جاری ہے۔ اور جب ہم  
 نے ہیں اُسے کے فاصلے کے نفیہ کر دیے  
 تو مال ہے مر جائے گا۔



سولہ سترہ سال کی انا جس قدر خوب صورت تھی، حساس بھی واقع ہوئی  
 تھی۔ شاید گھر کی خستہ حالت اور مال کی محنت و مشقت نے اسے  
 ضرورت سے زیادہ حساس اور زمانہ ساز بنا دیا تھا۔ ورنہ اس قدر بابر یک  
 باتیں نہ کرتی۔ وقت نے شاید جو اس چھوٹے سے گھرانے کو دکھ،  
 درد اور کرب دے رکھا تھا، اس نے ان کے اندر ضرورت سے زیادہ  
 احساس پیدا کر دیا تھا۔ جب ایک اجنبی کو ماں کے ساتھ اس طرح جان  
 پہچان کر رہتے دیکھا۔ اور اس کا باہر نکال دیا جانا اسے بہت عجیب سا  
 لگا تھا۔ اپنی ماں کے محتاط طرزِ عمل سے اس کے سینے پر ایک بھاری سی  
 ریل آ پڑی تھی۔ وہ ہلکے ہلکے قدموں سے واپس لوٹی تھی۔ اس کا رخ  
 ماں کے کمرے کی طرف تھا۔ جہاں سے وہ اجنبی اٹھ کر گیا تھا۔ بنانے  
 دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔ تقریباً بیس منٹ تو بٹھرا تھا وہ۔

کیا کہہ گیا تھا ماں کو۔ کیا کہا تھا ماں نے اس سے۔ اس قدر  
 پرانی جان پہچان کہ ایک ماں بیٹی کو جھڑک دے اور دونوں تنہائی میں  
 بات کرنے کے لئے اسے باورچی خانے میں بھیج دیں۔ جبکہ ماں جانتی  
 تھی کہ گھر میں دودھ اور پتی نہیں ہے۔ جب اس نے اس بات کا  
 اعلان کیا تھا تو اسے مزید اپنے سے دور کرنے کے لئے پڑوس میں  
 بھیج دیا تھا۔ جبکہ آج تک پڑوس سے ماں نے کوئی پیڑ نہیں منگوائی  
 تھی۔ یہ تو اسے کمرے سے دور رکھنے کا بہانہ تھا۔ یہ اشارہ تھا  
 کہ ادھر مت آؤ۔ جبکہ یہ بات ماں ویسے بھی کہہ سکتی تھی۔

انا یہی بات سوچتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی اور ماں کو وہیں اپنی  
 سابقہ حالت میں بیٹھے پایا، جہاں اسے چھوڑ گئی تھی۔  
 ”مہمان کو چھوڑ آئیں بیٹی۔“

”ہمارے گھر میں آنے والا شاید یہ پہلا مہمان تھا، جو میرے لئے قطعی  
 اجنبی تھا۔ کون تھا اُمی۔“

”اپنا تھا۔ غیر نہیں تھا۔“

”اگر اپنا تھا تو اتنا عرصہ کہاں رہا۔“

”میں پوچھ نہیں سکی اور ہاں بوا عاجرا کو کپڑے دے آؤ، بیس روپے  
 لانا، پیسے دینے کے معاملے میں بہت بخیل ہے وہ۔“ سائرہ نے

اس کے سوال کو ٹال دیا۔

”میں نے آپ سے جہاں کے بارے پوچھا تھا۔“ انا کا لہجہ کافی سنجیدہ تھا۔

”اس قدر کرید کر کیوں پوچھ رہی ہو۔؟“  
 ”صرف اس لئے کہ ماں کے بستے داروں کو جاننا اولاد کا بھی حق ہے۔“

اور —

”کچھ رشتے خونی ہوتے ہیں بیٹی — اور کچھ احساس سے تعلق رکھتے ہیں — اور میں چاہتی ہوں کہ مزید کوئی سوال نہ کرو کیونکہ یہی بہتر ہے۔“

”آپ کے لئے یا میرے لئے۔؟“  
 ساڑھ نے بیٹی کو خوشگلیں نگاہوں سے دیکھا اور مٹھرے مٹھرنے سے لہجے میں بولی۔

”تمہارے لئے بھی اور میرے لئے بھی —“  
 ”بہتر ہے جو آپ کا حکم — لیکن مجھے جاننے کیوں اپنا یہ رشتہ دار کچھ اچھا نہیں لگا۔“

”کیوں اچھا نہیں لگا۔؟“

”میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی پیاس دیکھی ہے۔“  
 ”پیاس کے بھی کئی رنگ ہوتے ہیں بیٹی — جاؤ کپڑے دے آؤ۔“

”میں آپ کے پاس کچھ دیر بیٹھنا چاہتی ہوں۔“ انا اپنے سابقہ لہجے میں بولی۔

”ضرور بیٹھو۔ لیکن مہمان کے بارے کوئی سوال نہیں کرو گی۔“  
 ”میرے سینے پر ایک سل سی آپڑی ہے امی، پہلے گھر کی بر بادی، آپ کی دن رات کی محنت اور بھوک کا ہی بڑا دکھ ہے۔“  
 ”پھر۔۔۔“ سائڈہ کی پھر بڑی سنگین ہنسی۔

”یہ اجنبی مہمان ایک نئی سوچ دے گیا ہے۔ من بھاری ہو گیا ہے امی۔ آپ اس کے بارے کچھ چھپا رہی ہیں۔“  
 ”ہاں چھپا رہی ہوں۔ اپنے تعلقات چھپا رہی ہوں، جو ماضی میں اس کے ساتھ رہ چکے ہیں۔ کیوں ہی کہنا چاہتی ہوں نا، تم۔۔۔؟“ سائڈہ ایک دم چیخ پڑی۔

”پلیز امی! آپ اس قدر رش نہ ہوں۔ میرا مطلب صرف اتنا تھا کہ۔“  
 ”تمہارا مطلب کچھ نہیں تھا سوائے ماں کے کردار کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کے۔ بیوقوف رٹ کی اگر تمہاری ماں کی چادر پر داغ ہوتا تو آج گھر کی حالت یہ نہ ہوتی۔ جاؤ چلی جاؤ اور آئندہ کبھی ہمارے دودھ پر شک نہ کرتا۔ اس میں نہ کبھی طاوٹ ہوئی ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔“  
 ”مم۔۔۔ میں معافی چاہتی ہوں امی! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ

تو بہت عظیم ہیں۔۔۔ انا پریشان ہو کر بولی اور سائڈہ نے اسی لمحے بیٹھے  
 بیٹھے اپنا رخ بدل لیا۔۔۔ جو اس بات کی علامت تھا کہ وہ مزید بات  
 نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ انا اٹھ کر باہر آگئی تھی۔

گو ماں پر وہ شک نہیں کر سکتی تھی، لیکن اجنبی کا کردار، اس کی آمد  
 اور ماں کا رویہ کوئی کہانی سنار بنا تھا۔۔۔ وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔  
 جب باہر نکلی تو اسے خرم نظر آیا جو شاید ابھی ابھی باہر سے لوٹا تھا۔  
 وہ معلوم ہوتا ہے امی نے پٹائی کر دی تمہاری۔۔۔ جو بارہ بج رہے  
 ہیں تمہاری صورت پر۔۔۔

”ادھر آئیے بھتیجا۔۔۔ آپ سے ایک بہت اہم بات کرنا ہے۔۔۔“  
 انا اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

اور خرم، جو اس سے دو سال بڑا تھا۔۔۔ جو بڑی وجہ شخصیت اور  
 نکھار لے ہوئے تھا۔۔۔ بہن کے پیچھے پریشان پریشان سا چل دیا۔  
 ”امی کو سلام بھی نہیں کرنے دیا تم نے۔۔۔ آخر کون سی قیامت آ  
 گئی ہے گھر میں۔۔۔؟“

”قیامت نہیں، ایک مہان آیا تھا۔۔۔“ انا اندر داخل ہوتے ہوئے

بولی:

”مہان اور ہمارے گھر میں۔۔۔ تعجب ہے۔۔۔“



”امی کا کوئی رشتہ دار تھا۔ بہت ہی پرانی جان پہچان والا۔“

”حالانکہ امی نے باپ کے رشتے دار اور اپنے تمام رشتے داروں کو گھر سے دور رکھا ہے۔ پھر یہ کیسا رشتہ دار تھا۔“ خرم حیرت سے بولا۔

”بیٹھو بھیا۔ میں پریشان ہوں۔“ انا چارہ بائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اور خرم بیٹھ گیا۔ پھر انا کچھ توقف کے بعد بولی۔

”امی نے اسے اندر بلوایا تھا۔ اور مجھے کمرے سے چائے کے

پہانے دور کیا تھا۔ بیس منٹ بعد وہاں چلا گیا۔ اور امی اس کے

بارے کچھ بتانے سے پرہیز کر رہی ہیں۔ میں نے پوچھا لیکن ریش ہو گئیں اور مجھے بھاگنا پڑا۔“

”پھر تو مجھے بات بھی نہیں کرنا چاہیے، امی کا معاملہ ہے۔ امی

جانیں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔“

”مجھے کچھ عجیب سا لگا ہے۔“

”ہماری امی بڑی عظیم عورت ہے انا۔ بس اس بات کو ضرور مد نظر

رکھنا۔ اگر وہ اس اجنبی کے بارے ہمیں کچھ بتانا نہیں چاہتیں، تو

ہمیں جاننے کے لئے صبر نہیں کرنا چاہیے۔“

”بہتر ہے بھیا۔ یونہی ہوگا۔ اب جائے آپ امی کو سلام کر آئیے۔“

”شکریہ۔“ خرم مسکرایا اور اٹھ گیا۔

”کہو کچھ بندوبست ہوا۔“

”جو تانیا خریدنا پڑے گا، ملازمت تلاش کرنے کے لئے۔“ خرم  
یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا اور سیدھا اپنی ماں کے پاس پہنچا۔

”آداب امی جان۔“

”جیتے رہو۔“ معلوم ہوتا ہے اس بے وقوف لڑکی سے گپ شپ  
کر کے آئے ہو۔ کیونکہ میں نے تمہارے قدموں کی آواز دس منٹ پہلے  
سنی تھی۔“

خرم مسکرا پڑا اور بولا

”دراصل ضرورت سے زیادہ ہی حساس ہے۔ وہ کسی مہمان کا ذکر  
کر رہی تھی۔“

”اب تم پوچھو گے اس کے بارے میں۔ کیوں۔“

”میں قطعی یہ گستاخی نہیں کروں گا امی جان۔ میں ماں کے رتبے  
کو سمجھتا ہوں اور پھر یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر آپ کوئی بات ہمیں نہیں بتانا  
چاہتیں تو اس میں کوئی بہتری ہوگی۔“

سائبرہ نے بیٹے کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا اور بولی۔

”مجھے تم پر غمزہ ہے بیٹے۔ اور ہاں کہیں کچھ بندوبست ہوا۔“

”ہاں! ایک دو جگہ آس بندھی ہے۔ پرائیویٹ فرمیں ہیں، تنخواہ کم ہے

لیکن وقتی طور پر کام چل جائے گا۔۔۔

”تمہیں پسند ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مت کرنا۔۔۔ مجھ میں ابھی بہت دم ہے بیٹے۔“

”میں جانتا ہوں، کتنا دم ہے اتنی۔۔۔ کاش میں آپ کو خوشیاں دے سکوں اور دنیا کی ہر نعمت آپ کے قدموں میں ڈال سکوں۔“

”گھبراؤ نہیں بیٹے! مال کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ زندگی میں کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھے گا تو۔۔۔ جتنی سختیاں تھیں، میں نے اپنی جان پر جھیلی ہیں۔ اب اچھے دن آئیں گے۔ اور بہت جلد آئیں گے۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ حق حلال کا رزق اس رزق سے بہتر ہے جسے کھاتے ہوئے ڈر آتا ہو۔ اور کبھی اسے کھانے کے بعد اگلنا پڑ جائے؟ اور ختم مسکرا پڑا۔ آگے بڑھ کر اس نے مال کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”میں لباس تبدیل کر لوں اتنی۔“

اور سائرہ مسکرا دی۔

جب خرم باہر آیا تو صحن میں انا موجود تھی جسے دیکھ کر خرم بولا۔

”امریکہ کے صدر پر دائرہ کیس بنا تھا اس حرکت پر۔“

”میں مال بیٹے کی باتیں سننے باہر نہیں نکلی تھی۔ اگر ایسی کوئی بات

ہوتی تو صحن کی بجائے برآمدے میں جناب کو ملتی —

”شام کے سائے پھیل رہے ہیں اور شاید سردی بھی ہے لہذا تمہیں

اس وقت کچن میں ہونا چاہیئے تھا۔“

اور انا خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی — وہ جان گئی تھی کہ اس کے بھائی کو اس وقت کھانے کی ضرورت ہے — ورنہ وہ عام حالات میں سات بجے سے پہلے کھانا نہیں کھایا کرتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لباس تبدیل کر کے کچن میں آگیا اور بولا۔

”آج کیا نصیب میں ہے؟“

”آلو اور چپاتی —“ انا بولی۔

”گھبراؤ نہیں، چند دن بعد گوشت کھلاؤں گا۔“

”کیسا ذائقہ ہوتا ہے اس کا بھیا؟“

”اگر بکرے کا ہو تو اچھا ہوتا ہے — اور اگر انسان کا ہو تو بدبو

آتی ہے۔“

”آپ بہت گزرے ہیں بھیا۔“

”کیا واقعی؟“

”سچی بات قبول کر لیا عظمت کی نشانی ہے۔“

”بہتر ہے — میں گزہ ہوں، میری بہن گزہ ہی ہے اور ہے کوئی نہیں

ورنہ اسے بھی گندہ کہہ دیتا —

”مجھے مت گھسیٹیں درمیان میں —“

”میں نے اپنی بہن کی بات کی ہے، تمہاری نہیں —“

انانے اسے مصنوعی غصے سے گھورا اور بولی۔

”پوسنے دو ناہ ہو گئے ہیں جب ایک پاؤ گوشت پکایا تھا —“

”قدرت بڑی بے نیاز ہے۔ شکر خورے کو شکر دیتی ہے — ہم دال

اور سبزی کھا کر جب اس کالا کھول بار شکر یہ ادا کر لیتے ہیں تو اوپر والے کو

کیا ضرورت پڑی ہے ہمارے شکر بجالانے میں کمی واقع کرے —“

”بات تو یہ بھی ٹھیک ہے —“ انابولی۔

”بس ذرا سوچ کی بات ہے — ویسے حقیقت یہ ہے کہ اس

وقت یہ ہماری آکو چپاتی، گوشت کے قتلے معلوم ہو رہے ہیں۔ دراصل

یہ خوب صورت پکوائی پر بات جاتی ہے — ہاتھ خوب صورت ہوں تو

ہر شے اچھی اور لذیذ پکتی ہے —“

”اس قدر مسکے کیوں لگایا جا رہا ہے —؟“

”ایسا مت کہو — میں تو ہر روز تمہاری تعریف کرتا ہوں۔ ویسے کیا

بات کہتی ہو کہ آج گھر میں آنے والا جہان کیسا تھا —؟“

”خوب صورت انسان تھا — گوجالیں بیالیں کے لگ بھگ رہا ہوگا

دیکھنے میں کافی حد تک بارعب اور سرمائے دار معلوم ہو رہا تھا۔ تھری پسی کا خوبصورت اور قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کنپٹیوں پر چند ایک بال سفید بھی تھے۔ جو اس کی شخصیت میں نکھار پیدا کئے ہوئے تھے۔

”کیا نام بتایا تھا اُس نے —“ خرم نے دوسرا سوال کیا۔  
 ”نام تو اُس نے نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس کی آمد کچھ عجیب سی تھی۔  
 یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دونوں کو اُس وقت سے جانتا ہو۔ جب ہم چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ کہہ رہا تھا کہ اُس نے بہت عرصہ پہلے جب میں چھوٹی سی تھی تو میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور بھیا اُس کی آنکھوں میں عجیب سی پیاس تھی اور خاص بات یہ ہے کہ امی نے مجھے چائے کے پہانے کرے سے نکال دیا تھا۔ جب میں نے پھر آنے کی کوشش کی تھی تو پڑوس میں جانے کو کہہ دیا تھا کہ دودھ پتی وہاں سے مانگ لاؤں۔ ہے نا عجیب بات —“  
 ”بولتی رہو — رکو نہیں —“

”اور دوسری خاص اور اہم بات یہ تھی کہ جب وہ مہمان امی کے کمرے سے باہر نکلا تھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جیسے پہلے بھی روتا رہا ہو —“

”ہاں یہ بہت زیادہ خاص بات ہے — کتنا وقت گزرا تھا امی



کے پاس —

”یہی کوئی ہیں بچیں منٹ —“

”چلو چھوڑو اس قہقہے کو۔ امی جانیں اور اُن کا مہمان۔ ہو گا کوئی پرانا

رشتے دار — ہماری مفلسی پر رو دیا ہو گا —“

”بھئی! اگر ایسی بات ہوتی تو امی مجھے کیوں دور رکھتیں کمرے سے۔“

”پھر تم کیا کہنا چاہتی ہو —“

”کچھ نہیں —“

”دیکھو انا — ایک بات یاد رکھنا۔ ماں پر کبھی شک نہ کرتا۔ اس

عظیم عورت کے دامن پر کوئی داغ نہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہماری

ماں نے ہمیں کن کن مصیبتوں سے پرورش کیا ہے۔ اس نے اپنی

پوری جوانی تیاگ دی ہے ہم دونوں کے لئے۔ اگر چاہتی تو دوسری

شادی کر سکتی تھی — لیکن نہیں، اس نے باپ کا سوتیلان ہمارے

سروں پر نہیں آنے دیا — یہی اس کی عظمت ہے۔ یہی اس کے

کردار کا نشان ہے۔ پتہ نہیں آنے والا کون تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ ہمارے باپ کے خاندان سے ہو اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ ہماری ماں

اب تھک چکی ہے۔ مزید حالات سے لڑنے کی اُن میں نہ سکت ہے

اور نہ طاقت اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماں کسی اچھے وقت اس مہمان

کے بارے میں ہم کو بتا دے لیکن تمہارا فرض ہے کہ سب کچھ بھول جاؤ۔ اور ماں کو کبھی بھی اس بات کا حکم نہ ہونے دو کہ ہم نے مہمان کے بارے میں کبھی ذہن پر آگندہ کیا تھا۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم ضرورت سے زیادہ اس مہمان میں دلچسپی لے رہی ہو اور ضرورت سے زیادہ اٹھی ہوئی ہو۔ کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔“

”میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی بھیا۔“ انا محتاط انداز میں بولی۔

”شکریہ انا۔۔۔! مجھے تم سے یہی امید ہے۔ کیونکہ ہماری ماں کے پاس کل سرمایہ، اپنی زندگی کی کل پونجی صرف ہم دونوں ہیں۔ یہی اس کا کل اثاثہ ہے اور یہی اس کی کائنات۔ ہم ہی اس کی زندگی کی سانس ہیں اور ہم ہی اس کے وجود کی حرارت ہیں۔“

”ایک چپاتی اور بنا دوں۔“

”نہیں بس شکریہ! پیٹ بھر گیا۔“ خرم مسکرایا اور ہاتھ دھو کر اٹھ گیا۔

انا بھی جواہر مسکرائی تھی اور اس نے یوں سر کو اثبات میں جنبش دی تھی جیسے اپنے بھائی کے خیالات سے متفق ہو۔



بزنس ہے کے کچھ اصول ہے ہوتے  
 ہیں اور اس کے طرح بد معاشی ہے کے  
 بھگے۔ جب کسی پر چڑھائی ہے کرنا  
 چاہو تو اس سے انسان کے کو اچھے طرح  
 ناپ تول اور جانچ لو۔ کہیں ہے ایسا  
 مذہب کہ وہ تمہارے حلقہ میں ہے پھنسے  
 جائے اور تم اپنا بھرم تک کھو بیٹھو۔



زندگی کی کشتی کھینچتے کھینچتے وہ آج جس منزل پر آ پہنچا تھا۔  
 وہ منزل بھی اُس کے وجود کی طرح خالی تھی۔ جیسے وہ اپنے  
 وجود کے سائے میں رہ گیا تھا۔ اور کوشش کے باوجود وہ  
 منزل تک پہنچ سکا تھا۔ جب وہ اپنے آشنا نے سے بیوی اور بیٹی کو  
 دیکھ کر لوٹا تھا تو اپنے اندر بے پناہ کرب سمیٹ لایا تھا۔ کس قدر  
 مفلسی تھی اُس گھر میں۔ جہاں اُس کے دو بچے اور بیوی رہتی تھی۔  
 خود اس کے پاس لاکھوں روپیہ تھا۔ لیکن حالات سے لڑتے لڑتے  
 بھول جیسے تین چہرے کلا گئے تھے۔ اُس نے اپنی بیٹی کو دیکھا تھا  
 جو بڑھ رہی تھی۔ کس قدر تلخ تھی۔ شاید اُس کے اندر اتنا زہر حالات  
 نے بھر دیا تھا۔ بھوک اور کم مائیگی نے دے دیا تھا۔ کس قدر کٹیلے  
 الفاظ تھے اُس کے۔

”ماں اگر سہارا لے کر زندہ رہنا چاہتی تو آج ہمارے گھر کی حالت یہ نہ ہوتی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے دودھ پتی کے لئے پڑوس نہ جانا پڑتا۔“

”اُف میرے خدا۔“ وارث کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی تھی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھا ہوا اپنے فلیٹ کی طرف رواں دواں تھا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر روشنی کے بلب جل اٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ لیکن ایک وارث تھا جو اپنے گھر کو چھوڑ کر وجود کے سائے میں گم ہوئے جا رہا تھا۔ مگر نہیں وہ تو اپنے ساتھ ایک کرب لئے جا رہا تھا اور اس کرب میں روشنی کی ایک مدھم سی لکیر پھیل رہی تھی۔ اور وہ روشنی کی کرن ساڑھ تھی جس کو دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اُس کا ہی انتظار کرتی رہی ہو۔ اُسے دیکھ کر وہ پریشان نہ ہوئی ہو بلکہ جی بھر کے دیکھنا چاہتی ہو۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا جیسے خوفزدہ بھی ہو۔ شاید اولاد سے خوفزدہ تھی۔ آخر کیوں؟

وہ انہیں بتا کیوں نہیں دیتی تھی کہ میں اُن کا باپ ہوں۔“

شاید وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ عجیب تہٹ دھرم اور صندی عورت تھی۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ لیکن اب بھی اپنے اصولوں پر

تنی کھڑی تھی —

وارث نے محسوس کیا تھا کہ جیسے وہ اُس سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتی ہو، اپنی باتیں، اس کی باتیں — انا اور خرم کی باتیں، گزرے ہوئے پندرہ سولہ سال کی باتیں، لیکن وہ نہیں کر سکی تھی۔

جب وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو چابی لینے کی اُسے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ فلیٹ نیم دستا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ زہرہ جمال ابھی تک وہیں موجود تھی۔ جب دستک دے کر اندر داخل ہوا تو وہ اُس کے سواگت کے لئے آگے بڑھ آئی تھی۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ اتنی جلدی لوٹ آئیں گے۔“

”آپ کا خیال تھا کہ شاید پھر سال بعد لوٹوں گا۔“

”نہیں اتنا لمبا جوڑا خیال بھی نہیں تھا۔“ وہ منہس دی تھی۔ اُس

کے موتیوں ایسے دانت وارث کو بہت بھلے لگے تھے۔

”چائے چلے گی یا کھانا۔“ وہ اپنا اون کا گولا اور سلاسیا سے

سمیٹتے ہوئے بولی۔ شاید وہ تنہا بیٹھی سوئیر بن رہی تھی۔

”ہر دو گھنٹے بعد کھانا کھانے کی مجھے عادت نہیں۔ باقی رہا چائے کا

معاملہ، تو مناسب نہیں ہے کہ بار بار آپ کو زحمت دوں۔“

”جب آپ پہلے یہاں رہتے تھے تو اپنی ضروریات کیسے پوری



کرتے تھے۔“

”نیچے بہت ہوٹل ہیں اور ہوٹلوں میں ضرورت کی ہر شے ملتی ہے۔“  
 ”گھر جیسا مزہ تو نہیں ہوتا۔“

”شاید آپ درست کہہ رہی ہیں۔ لیکن بحالتِ مجبوری انسان کو  
 قناعت کرنا پڑتی ہے۔“

”بہر کیف سالن وہی ہے جو آپ پہلے کھا چکے ہیں۔ البتہ سوٹ  
 ڈش کا اضافہ کیا ہے۔ آج کیونکہ آپ میرے ہمان ہیں۔ اس  
 لئے کل سے آپ ہوٹل جاسکتے ہیں۔“

”بہتر۔۔۔ جائے چائے بنالائیے۔“ وارث کو مجبوراً  
 ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

”وہ سامنے تھرماس رکھا ہے اور دو عدد کپ بھی تپائی پر رکھے  
 ہیں۔ اگر اجازت دیں تو بنا دوں۔“

”کمال ہے، آپ پہلے سے ہی تیار کئے بیٹھی ہیں۔“

”میں نے سوچا کہ آپ کھانے کے وقت سے پہلے آگئے، تو  
 سردی میں چائے بہتر رہے گی۔ کیونکہ سال بعد تو آپ کو اچھی گھر کی  
 چائے نصیب ہو رہی ہے۔ لہذا آپ پہلے سے انکار نہیں کریں گے۔  
 اس لئے بنالائی تھی۔“

وارث نے اُس کے ان ریمارکس پر اُس کی طرف غور سے دیکھا کہ یہ طنز کس انداز سے کیا گیا ہے — لیکن وہ تو وہ تو مسکرا رہی تھی۔ لہذا وارث بھی جواباً مسکرایا اور بولا۔

”آپ کو شاید کوئی شدید قسم کی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے میرے بارے۔“  
 ”اگر آپ ایسا محسوس کرتے ہیں کوشش کیجئے کہ واضح ہو جائے۔“

”کیا یہ ضروری ہے۔“  
 ”اتنا ضروری بھی نہیں کہ تعلقات خراب کئے جائیں۔“ لفظ تعلقات پر زہرہ جمال نے کافی زور دیا تھا۔ جس پر وارث چونکا تھا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔

”چائے بنائیے۔“  
 ”ابھی لیجیے۔“ وہ سرایا اخلاق اور میزبان بن گئی۔ اور کچھ توقف کے بعد وہ کپ میں چائے ڈال کر لے آئی اور اُسے وارث کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”بھائی جان آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“  
 ”اگر میں نے اُنہیں سال بھر کا کرایہ دے دیا تو ضرور خوش ہوں گے۔“  
 ”ورنہ سامان بحق کرایہ ضبط۔“

”ارے نہیں وہ ایسے نہیں ہیں۔ بڑے فراخ دل اور رحم پرور۔“

ہیں۔ اور ساتھ ساتھ کھلے ذہن کے۔۔۔

”وہ تو مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر اندازہ ہو گیا ہے۔۔۔“

”جیسے کچھ تو اندازہ ہوا۔۔۔“

”اندازوں کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔۔۔“ وارث کا انداز ذرا معنی

تھا۔۔۔

”جہاں غلطی ہوگی میں درست کر دوں گی۔۔۔“ وہ زیرِ لب

مسکرائی۔۔۔ اور یہ جملہ اور مسکراہٹ وارث کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور بولا۔

”آپ کے بھائی جان کی تشریف آوری کب تک ہو جائے گی۔“  
”بس کسی دم پہنچنے والے ہیں۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے انہیں آپ کے بارے میں علم ہو جائے گا کہ گمشدہ کرائے دار واپس لوٹ آیا ہے۔ ویسے بھائی جان کا خیال تھا کہ آپ کہیں یا داشت کھو کر ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے۔۔۔“

”اچھا خیال تھا۔۔۔ لیکن یہ تو اُن کا خیال تھا۔ آپ کا کیا اندازہ تھا۔۔۔“

”آپ کو دیکھ کر کچھ کر لیا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا اظہار

کروں —

”بہتر —“ وارث اب اس سے مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت گو اس میں دلچسپی لے رہی ہے لیکن اپنے اندر شکوک کا انبار لئے ہوئے ہے۔ اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وارث خود بھی محتاط ہو گیا تھا — لیکن وہ خاموش نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسے پوری طرح پڑھنا چاہتی تھی اور وارث اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

زہرہ جمال جو وارث کی طرف بھردیکھ رہی تھی، بولی۔

”آپ کیا کاروبار کرتے تھے؟“

”تھے، سے کیا مراد ہے آپ کی؟“

”میرا مطلب ہے بقول بھائی جان، یادداشت کھو کر ادھر ادھر ہو گئے

تھے۔ اس لئے میں نے سال پہلے کئے جانے والے کاروبار کے بارے

معلوم کیا تھا۔“

”میں اب بھی وہی کام کرتا ہوں جو ایک سال پہلے کرتا تھا۔“

”کون سا کام؟“ میرا مطلب ہے اس کام کی نوعیت کیا ہے؟“

”بالکل پرسنل سوال ہے۔“ اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ اس قدر

کیوں مجھے کرید رہی ہیں؟“

”انسانی تجسس کی وجہ سے — اگر آپ بتانا نہیں چاہتے تو کوئی مضائقہ نہیں —“

”اور آپ پھر کوئی اوٹ پٹانگ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گی۔“

”ظاہری بات ہے اور پھر یہ بالکل انسانی فطرت ہے —“

”وارث نے مسکرا کر بات اڑادی اور وہ خود بھی مسکرا پڑی — پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔“

”آپ کے کاروبار میں، مارپیٹ، گھیراؤ، جلاؤ اور تشدد کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار گولی کا دھماکہ بھی ہو جاتا ہوگا —“

وارث نے پہلی بار اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔

”آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“

”جی —“ وہ ایک دم ہولنق ہو گئی۔

”میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“

”میرے سوال سے شادی کا کیا تعلق ہے؟“ وہ اُلجھ کر بولی۔

”تعلق نہیں تو پیدا کرنے کی کوشش کروں گا —“

”اگر یہ بات ہے تو بتانے میں کوئی نقصان نہیں — ہاں میری

شادی ہوئی تھی —“

”ہوئی تھی سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”طلاق ہو گئی —“

”کتنے عرصے بعد —“

”سات ماہ گیارہ دن بعد —“

”او — مجھے دکھ ہوا —“ وارث تاسف سے بولا۔

”لیکن مجھے دکھ نہیں ہوا تھا کیونکہ طلاق میں نے خود لی تھی — اور جس

دن عید کی ہوئی تھی اور میں اس بندھن سے آزاد ہوئی تھی بہت خوش

ہوئی تھی — یوں معلوم ہوا تھا جیسے کسی بدبو دار پنجرے سے نکل آئی

ہوں — بہر کیف یہ دوسری کہانی ہے۔ امید ہے کہ آپ میرے جواب

سے مطمئن ہو گئے ہوں گے —“

”آپ کی اس وقت عمر کیا ہے —“

”آپ نے کیا اندازہ لگایا ہے —“

”اندازے تو غلط بھی ہو جاتے ہیں —“

”اڑتیس کے ہگ ہگ ہوں —“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے بھر شادی ہی نہیں کی —“

”ہاں ضرورت محسوس نہیں کی تھی —“

”اب کیا پوزیشن ہے —“

”کیا مطلب —“ وہ وارث کے سوال پر بے ساختہ چونکی تھی۔ اس

کے چہرے پہ اُبھر آنے والے تاثرات کچھ ایسے تھے، جیسے وہ پریشان ہو گئی ہو۔

”مطلب یہ کہ کیا آپ اس اسٹیج پر ضرورت محسوس کر رہی ہیں؟“  
 ”یہ آپ نے کس بات سے اندازہ لگایا؟“ وہ چپیں رہ جہیں ہو کر بولی۔  
 وارث مسکرایا اور بولا۔

”اب آپ نے میرے کاروبار کے متعلق کوئی سوال کرنا ہے؟“  
 ”نہیں۔“ وہ ایک دم اٹھ گئی جیسے وارث کے سوالات کی سنگینی نے اسے پریشان کر دیا ہو۔  
 ”ارے بیٹھے نا۔“

”شکریہ، پھر حاضر ہوں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وارث سمجھ گیا کہ محترمہ ناراض ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ اس نے اپنے انداز سے کے مطابق پتہ دیا تھا اور سچ کیونکہ کڑوا ہوتا ہے اور وہ بھی اگر کسی عورت کے سامنے کہہ دیا جائے تو بات بگڑ جاتی ہے۔ اور شاید بات بگڑ گئی تھی۔ وہ ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ وارث کو اس کے جانے کے بعد احساس ہوا، جیسے اسے یہ تنہائی اچھی نہ لگی ہو۔ وہ اس سے باتیں کرتی ہوئی اچھی لگ رہی



تھی۔ کم از کم تلخ اور سنگین خیالات کی پینار سے بچا ہوا تھا۔ — ادھر وہ گئی  
 ادھر اسے انا یاد آگئی۔ — ختم یاد آگیا اور سائڈہ کی صورت سامنے آ  
 کھڑی ہوئی۔ — چائے ختم ہو گئی۔ اس نے دوسرا کپ پھر اس سے بھر لیا۔  
 سگریٹ سلگا اور ختم ہو گیا۔ — لیکن زہرہ نہ آئی۔

وہ اسٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکے سے دروازہ  
 کھلا۔ — اور تین آدمی اندر گھس آئے۔ — اور وارث انہیں دیکھ کر یوں  
 اچھلا تھا جیسے سونے کے سپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔ — ان تینوں  
 میں وہ نکئی بھی تھا جو جیل کے باہر اسے ملا تھا۔ — بھدے ہونٹوں والا موٹا  
 نکئی۔ — وارث باقی دونوں کو بھی جانتا تھا۔ — وہ شیخ امان اللہ کے آدمی  
 تھے۔ — جنہیں خوشخوار کتے کہا جاسکتا تھا۔ — نکئی کے ہونٹوں پر سگار دبا ہوا  
 تھا اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح وارث کو گھورے جا رہا تھا۔  
 وارث بالکل ساکت کھڑا تھا۔ — اور نگاہیں ریوالور واسے پر جمی ہوئی تھیں۔  
 خونخاک دہانے والا ریوالور جس کی تالی وارث کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ —  
 اچانک نکئی نے اپنے بھدے ہونٹوں سے سگار نکالا اور وارث سے بولا،  
 ”تمہارا بھیجا ہوا تحفہ شیخ صاحب کو بہت پسند آیا ہے۔ —“  
 ”یقیناً پسند آیا ہوگا۔ —“ وارث کینہ توڑ نظروں سے اسے گھورتے  
 ہوئے بولا۔

موٹانکی مسکرایا اور بولا۔

”ہاں انہیں بہت پسند آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تمہیں یہاں

نظر آ رہے ہیں۔“

”کیا چاہتے ہو۔“

”شیخ صاحب فرما رہے تھے تمہیں بڑی عزت سے لایا جائے۔ اور

اگر تمہیں عزت پسند نہ ہو تو پھر بندل بنا کر گاڑی کی ڈگی میں ڈال دیا

جائے۔ اگر سالنوں کی آمد و رفت جاری رہے تو ان تک پہنچا دیا جائے

ورنہ کسی گٹر میں پھینک کر قصہ ختم کر دیا جائے۔ لہذا اب تم بتاؤ کہ

کس طرح جانا پسند کرو گے۔“

”تمہارے شیخ کے حلق میں سپنس جاؤں گا موٹے۔ بہر کیف بات

کر لینے میں کوئی نقصان نہیں۔“ وارث کا لہجہ بڑا نہ ہر لیا تھا۔ پھر

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”چلو۔“ وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔

وہ مینڈل اس سے بھی زیادہ پھر تیلے تھے۔ بڑی تیزی سے برابر

پہنچے تھے اور وارث کو درمیان میں لے کر چلتے ہوئے سیرٹھیاں اترنے

لگے۔ ریوالور والا وارث کے پیچھے تھا۔ موٹانکی پھدک پھدک کر

بالکل مینڈک کی مانند سیرٹھیاں اتر رہا تھا۔ ایک ساتھی وارث کے بائیں

ہاتھ تھا۔ جب چار سیڑھیاں رہ گئیں تو وارث ایک دم پیچھے گیا۔ رلیو اور والا اس کے اوپر گرا تھا اور وارث نے اسے اپنے اوپر سے اچھال کر موٹے پردے مارا تھا۔ پھر بائیں ہاتھ والے کو سنبھالنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ یہ یک تخت کیا ہو گیا ہے۔ جب اس کے منہ پر وارث کا ہاتھ پڑا تو اس کی بنیادی وقتی طور پر جانی رہی تھی۔ وارث نے پھر رلیو اور والا کو اٹھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ بجلی ایسی تیزی سے اس پر جا پڑا تھا۔ اور اس کا رلیو اور ہاتھ میں لیتے ہوئے نیچے آخری سیڑھی تک جا پہنچا۔

”اب تم لوگ شرافت سے چلتے رہو۔“ خبردار آواز نہ نکلتے۔“  
وارث رلیو اور کو جنبش دے کر بولا۔

وہ تو اچھا تھا کہ اندھیرا چھا چکا تھا اور سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے کسی کراٹے دار سے سامنا نہیں ہوا تھا۔  
”تینوں نے بیک وقت وارث کو گالی دی تھی۔“

”اچھی زبان استعمال کرنا سیکھو۔“ اور اگر یہ زبان تم لوگوں کی ماوری زبان ہے تو بڑا نہیں مالوں گا۔ ورنہ جو تحفہ شیخ صاحب کو پسند آیا تھا، میں نہیں چاہتا کہ تین مزید تحفے اسے رول کر کے بیچ دوں۔“  
”پچھتا نے کا وقت شاید تمہیں نہ ملے۔“ موٹانگی بولا۔

”خاموشی سے چلتے رہو۔“ وارث کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

وارث تینوں کو لئے گاڑی تک پہنچا تھا۔

”چلو بیٹھو اندر۔“ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔ اس طرح ہانا میری

عزت نہیں تھی اب اس طرح جانے میں بھرم بھی ہے اور وقار بھی۔“

تینوں نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ پھر باری باری خاموشی سے

اندر بیٹھ گئے تھے۔ وارث ترچھا ہو کر فرنٹ سیٹ پر نیکی کے ساتھ

بیٹھا تھا۔ ریو اور اس نے اب بھی ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

”حرامزدگی نہیں کرنا موٹے۔“ میں نے تمہیں وارننگ دی تھی کہ اپنی

مخصوص صورت نے کہ میرے سامنے مت آنا۔ لیکن تم نے شاید اس

بات پر غور نہیں کیا تھا۔“

”اب ضرور کروں گا۔“ نیکی کا لہجہ بڑا سفاک تھا۔ پھر اس نے

گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ وارث جو ترچھا بیٹھا ہوا تھا جس کی نظر پیچھے

بیٹھے ہوئے دو بد معاشوں پر تھی۔ اور احتیاط بہت رہا تھا کہ یہ دونوں

اچانک اسے کہیں چھاپ نہ بیٹھیں۔

نیکی نے ہونٹوں میں سگار دبا رکھا تھا اور بڑی سنگین خاموشی سے

ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پھر ٹھیک پندرہ منٹ بعد اچانک وارث نے

اسے گاڑی روکنے کو کہا۔

”کیوں، کیا بات ہے۔“

”جو کہہ رہا ہوں وہی کرو موٹے! انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔“  
 وارث کا لہجہ بڑا خوشخوار تھا۔ لہذا نگئی نے گاڑی ایک طرف روک دی۔  
 وارث ریوالور سنبھالے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔  
 ”اب تینوں باہر آ جاؤ۔ اور اپنے اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لو۔“  
 ”کیا کرنا چاہتے ہو۔“ نگئی باہر نکلتے ہوئے غرایا۔

وارث نے ریوالور کو جنبش دی اور تینوں کو ایک طرف اترنے کو  
 کہا۔ یہ علاقہ کافی سسنان تھا اور زمین پلاٹوں کے حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔  
 شاید وہاں تعمیراتی منصوبہ تیار ہو رہا تھا۔ تینوں اُسے گھورتے ہوئے  
 شرک سے نیچے اتر آئے۔ شرک کے ایکٹرک پول کی روشنی اُس طرف  
 زیادہ نہیں پڑ رہی تھی۔ وارث ایک مناسب جگہ پر رُک گیا اور تینوں کو  
 بھی رکنے کو کہا۔

”اس ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔ کیونکہ میں چیک کر چکا ہوں اور اتفاق  
 سے تم تین ہو۔ لہذا فی فرد دو عدد گولیاں کچھ مناسب نہیں۔ اس لئے میں  
 چاہتا ہوں کہ تم تینوں اس بات کا فیصلہ کر لو۔“  
 ”کیا مطلب۔“ نگئی غرایا۔

لیکن وارث نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ بلکہ دونوں کو مخاطب

کمر کے بولا۔

”تم دونوں اگر زندگی چاہتے ہو تو اس موٹے سؤر کو مارو۔  
اتنا مارو کہ یہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے، ورنہ۔۔۔“  
”ورنہ کیا۔۔۔؟“ دونوں میں سے ایک غرایا۔

”اس ریوالور پر سائلنسر لگا ہوا ہے۔ چلنے کی آواز تک نہ ابھرے گی۔۔۔“

”یہ دیکھو۔۔۔“ اتنا کہہ کر وارث نے ایک کی ٹانگ پر گولی دے ماری اور وہ ایک دم چیخ کر دوہرا ہو گیا۔  
”خبردار آواز نہ نکلے ورنہ دوسری گولی سینے میں مار دوں گا۔۔۔“  
وارث غرایا۔۔۔ پھر مزید بولا۔

”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس موٹے کو مار دو۔۔۔ اے چلو تم مارو۔ تمہارا ساتھی چند لمحے اپنا زخم دیکھ لے۔۔۔“ وارث نے دوسرے سے کہا جو خوفزدہ انداز میں وارث کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا واسطہ کسی ہوشمند انسان سے نہیں۔

”مارو موٹے کو۔۔۔“ وارث نے ریوالور کو جنبش دی۔۔۔ اور وہ اچھل پڑا، پھر آہستہ آہستہ موٹے کی طرف بڑھنے لگا۔

”کک۔ کیا کر رہے ہو سؤر کے بچے۔۔۔“ نیکی بوکھلا کر بولا



اور سنا تھری چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن وہ سوڑ کا بچہ رکا نہیں آہستہ آہستہ  
 ننگی کی طرف بڑھتا رہا اور جب ننگی نے دیکھا کہ اس کا ساتھی ہی اس کے  
 خلاف ہو گیا ہے تو خود بھی پوزیشن میں آ گیا۔

”تم دونوں میں سے وہی میری گولی سے بچ سکتا ہے جو اپنے پاؤں پر  
 کھڑا رہ گیا۔ ورنہ موت اس کا مقدر ہے۔“

وارث کا لہجہ بڑا سفاک تھا۔ اچانک ننگی کے ساتھی نے اس پر چھلانگ  
 لگا دی اور ننگی کا گھونسا اپنے ساتھی کے منہ پر پڑا۔ وہ ہبلا کر ننگی سے  
 گتھم گتھا ہو گیا۔ پھر کچھ ہی لمحوں بعد یوں لگا جیسے دونوں انسان وحشی  
 ہو گئے ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کو نوح گھسوت رہے تھے اور تیسرا  
 اپنی ٹانگ کا زخم دباتے وہیں زمین پر بیٹھا عجیب بے بسی کے عالم  
 میں ہونٹ چبا رہا تھا۔ وارث ریلو اور یئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ  
 دونوں کو وحشیوں کی طرح لڑتے دیکھتا رہا۔ اچانک وارث نے زخمی  
 کی طرف دیکھا اور غرا کر بولا۔

”چلو تم بھی اٹھو۔ اور اپنے ساتھی کی مدد کرو۔ اس پر  
 بھاری پڑ رہا ہے اور ویسے بھی مجھے تم دونوں سے کوئی عداوت  
 نہیں۔ چلو شاباش اٹھ جاؤ ورنہ مجھے دوسری گولی ضائع کرنا پڑیگی۔“  
 ”مم۔۔۔ میں زخمی ہوں، گولی میری ٹانگ میں رہ گئی ہے۔“ وہ



تکلیف کی شدت سے ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

”چلو ٹھیک ہے آرام کرتے رہو۔“

اتنا کہہ کر وارث نے دونوں کی طرف دیکھا جو پاگوں کی طرح ایک دوسرے پر گھونسلے چلا رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو شاید جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ دونوں کے منہ سے غراہیں سی نکل رہی تھیں اور پھر یہ لڑائی پندرہ منٹ بعد ختم ہو گئی۔ دونوں زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں بڑی طرح زخمی تھے۔ ان میں اتنا دم نہیں تھا کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اچانک وارث پتھر پر سے اٹھا اور انہیں مخاطب کر کے بولا۔

”آئندہ کبھی میرے فلیٹ کا رخ نہ کرنا ورنہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور ایک بات یاد رکھنا۔ بد معاشی کا پہلا اصول ہے کہ جب کسی پر حملہ آور ہوتا ہو تو اسے اچھی طرح جانچ لو۔ کہ وہ کیا شے ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ شرک کی طرف بڑھ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ گاڑی میں بیٹھا واپس جا رہا تھا۔ بارونق علاقے میں آکر ایک جنرل سٹور پر گاڑی روکی اور وہاں فون پر کوئی نمبر ملایا۔ جیسے ہی کسی نے ریسپور اٹھایا وارث بول پڑا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ وارث لا وارث نہیں ہے۔ وہ کام صرف  
 روپے کی خاطر کرتا ہے لیکن حاکیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ آئندہ کام لینا ہو  
 تو برابر کا سلوک کرنا ورنہ۔۔۔“

وارث نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نون رکھ دیا۔ جب اُس نے  
 جنرل سٹور کے مالک کی طرف دیکھا تو وہ اُسے گھور رہا تھا۔ وارث  
 نے جیب سے پیسے نکالے اور کاؤنٹر پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ اب اُس  
 کاؤنٹر بجائے فلیٹ کے کسی اور طرف تھا۔ وہ بڑی فراخ دلی سے موٹے  
 نیچے کی گاڑی استعمال کر رہا تھا۔



وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ وہ عورت جس کی کوکھ بانجھ ہو — ایسی زمین  
 جو بے آب و گیاہ ہو — وہ آسمان جس پر سورج، چاند اور ستارے  
 نہ ہوں — وہ چین جس میں سبزہ و گل کے رنگ — خوشبو اور شبنم  
 نہ ہو — اور وہ گھر جس کی آسیب زدہ دیواروں میں سناٹے بٹتے ہوں۔  
 یہ سب تقدیر کا کیسا بھیاہک مذاق لگتے ہیں اور وہ سب کس قدر بے رحم  
 اور قابلِ توجہ ہوتے ہیں

زہرہ جمال بھی اُن میں سے ایک تھی۔ جس کی کوکھ بانجھ تھی، اور  
 اس بات کا علم شادی کے سات ماہ بعد اُس کو ہوا تھا — اور جب  
 اُسے اس تلخ اور ناقابلِ برداشت حقیقت کا علم ہوا تھا تو وہ اندر سے  
 ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی اور جب اُس کے شوہر نے — پیار  
 کرنے والے شوہر نے اُس سے کہا تھا کہ تم بانجھ ہو تو اسے یوں

محسوس ہوا تھا جیسے اُسے کوئی غلیظ گالی دے دی گئی ہو۔ اُس کے منہ پر تھوک دیا گیا ہو۔ اور اسی دن اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی نگاہوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا ایک ماہ کی اذیت ناک زندگی گزارنے کے بعد اُس نے طلاق لے لی تھی اور اُس دن اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی بند پنجڑے سے رہائی ملی ہو۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بدل گئی۔ اُس نے جینا سیکھ لیا تھا۔ لیکن کب تک۔ اُس کی خاموش زندگی میں اچانک شگاف پڑ گیا۔ جب وارث کا کمرہ نل کھلا رہنے سے پانی سے بھر گیا تھا اور اُس کے بھائی کو تالا توڑ کر اندر داخل ہونا پڑا تھا تو وارث کی تصویر اُس نے دیکھی جو اُس کے دل میں کھب گئی۔ اُس نے وہیں رہنا شروع کر دیا تھا۔ پھر چند ہفتوں میں ہی اُسے یوں لگنے لگا جیسے یہ گھر اُس کا ہی ہے۔ وہ سامنے تصویر میں مسکراتا چہرہ اُس کا اپنا ہو۔ جیسے جسم کا کوئی ایسا اہم حصہ ہو جہاں جذبات ملتے اور جوان ہوتے ہوں۔ پھر اُس نے اپنے بھائی سے وارث کے بارے کچھ سوالات کئے جس سے اُسے اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ تنہا انسان ہے۔ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے، کچھ نہیں معلوم۔ البتہ یہ ضرور پتہ چلا کہ صاف ستھرا انسان ہے۔ پھر دن بیتے چلے گئے

لیکن وارث کہیں کھو گیا۔ وہ اُسے دیکھنا چاہتی تھی۔ جیسے اپنی انجالی خواہشوں کا مرکز بنا بیٹھی ہو۔ وہ دن بدن اُس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس قدر قریب کہ کبھی کبھار اُسے گمان گذرتا جیسے وہ وارث کے بغیر نامکمل ہے۔ پھر پورا سال گزر گیا، اور وارث لوٹ آیا۔ بالکل اس کی امنگوں میں ڈھلا ہوا، بارعب اور وہا بہت آمیز شخصیت۔ لیکن اُس نے جب دیکھا کہ وہ کچھ الجھا ہوا انسان ہے اور اس کی مصروفیت عام لوگوں سے مختلف ہیں تو وہ پریشان ہو گئی۔

اُس نے اپنے آپ کو ٹھوٹا۔ کہ اُسے زہرہ جمال جبکہ تیرے پاس اُسے دینے کو کچھ نہیں پھر تو اس سے لینے کی کیا امید رکھتی ہے۔ وہ اچھا ہے بائرا۔ اُسے کھونا مت۔ اُسے بتا دے کہ تو گیا چاہتی ہے۔ اگر اولاد پیدا نہیں کر سکتی تو تمہارے اندر جذبات کا ایک سرسراتا ہوا طوفان تو موجزن ہے۔ تمہارے احساسات میں جو آگ کی بیٹیں ہیں کیا ان میں ہمیشہ اپنے آپ کو جلاتی رہے گی۔ یہ سب کچھ سوچ کر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ۔ کچھ بھی ہو وہ وارث کو اپنائے گی۔ اُسے اپنے درد میں برابر کا حصے دار بنائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب بھی اپنے بھائی سے بات کر کے فلیٹ میں موجود تھی۔ اُس کے بھائی نے اُسے اس بات کی اجازت دے

دی تھی کہ اگر وارث اُسے اپنا نا چاہتا ہے تو اُسے کوئی انکار نہیں۔ وہ اپنی کوشش کر دیکھے۔

اس نے سالن کو تین بار گرم کیا تھا اور اب رات کے نو بج رہے تھے۔ اس نے سیرٹھیوں میں ہونے والا ڈرامہ بھی دیکھا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وارث کو اپنے تینوں درست پسند نہیں آئے تھے۔ شاید وہ بھی اس کے فلیٹ میں گھس آئے تھے۔ اس سے آگے اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ وہ اتنی بچی نہیں تھی کہ حالات کو نہ سمجھ سکتی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وارث واپس لوٹا تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ اسے فلیٹ میں دیکھ کر بری طرح چونکا اور ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر بولا۔

”اس وقت تو آپ کو اپنے بستر میں ہونا چاہیے تھا۔“  
 ”در اسل انتظار کی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ اس لئے وقت کے گزر جانے کا احساس نہ ہو سکا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ وارث الجھ کر بولا۔  
 ”کھانا دوبار گرم کر چکی ہوں۔ آئیے پہلے اس سے نیپٹ لیں۔  
 باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“

”آپ کے سبائی جان اس وقت کہاں ہیں۔“ وارث رات کے

سنائے میں اسے اپنے اس قدر قریب دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا تھا۔  
تب وہ مسکرا پڑی اور بولی۔

”انہیں معلوم ہے کہ میں نے آج آپ کی دعوت کی ہوئی ہے اور  
آپ کی آمد کا انتظار کر رہی ہوں۔“

وارث نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور وہ مسکرا کر اپنی  
جگہ سے اٹھ گئی اور بولی۔

”کھانا لگا رہی ہوں، تیار ہو جائیے۔“

وارث نے ایک بار پھر کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت کا اندازہ کیا  
پھر جیسے ہی اس نے زہرہ کی طرف دیکھا تو احساس ہوا جیسے وہ پہلے سے  
زیادہ نکھری نکھری ہو۔ جیسے اس نے اپنے آپ کو بہت ہی غیر محسوس انداز  
میں بنایا سنوارا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مدھم سی لب اسٹک موجود  
تھی۔ وہ تپائی پر خاموشی سے کھانا لگا رہی تھی۔ اور اس کے سیاہ  
بال جو پہلے بندھے ہوئے تھے اب ہر بندش سے آزاد تھے۔ وہ اسے  
دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ کھانا باہر سے کھا کر آیا تھا اسے قطعی بھوک نہیں  
تھی لیکن وہ بنجانے کیوں اس کا اظہار نہ کر سکا تھا۔ وہ اچانک سالن  
کا ڈونگا اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ شاید وہ ٹھنڈا ہو گیا تھا اب وہ تیسری  
بار اسے گرم کر رہی تھی۔ وارث نے اپنے آپ کو ڈھیل چھوڑ دیا تھا۔



موتے کی پشت سے ٹک کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر وہ اس  
کی مترنم آواز پر ہی سیدھا ہوا تھا۔

”بار بار گرم ہونے والا سالن اپنا ذائقہ کھودیتا ہے۔“  
وارث کچھ نہ بولا تھا۔ خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا  
پھر اس نے زہرہ جمال کی طرف دیکھا اور بولا۔  
”آپ کیوں نہیں کھا رہیں؟“  
وہ مسکرا دی اور بولی۔

”بھائی جان کے ساتھ کھا چکی ہوں۔“  
”آپ کے بھائی جان اپنی سمجھ میں نہیں آئے۔“  
”بہت اچھے اور مخلص انسان ہیں۔“  
وارث خاموش ہو گیا۔ دو چار لقمے لینے کے بعد اس نے ہاتھ روک  
لیا تھا۔

زہرہ نے اس کی طرف خشمگین نظروں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو  
کہ کم از کم میرے انتظار کا ہی کچھ بھرم رکھ لیا ہوتا۔ اور وارث اسے  
لگتا ہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔

”دراصل ایک دوست نے زبردستی کھانا کھلا دیا تھا۔“  
”آئندہ آپ کھانا گھر پر کھایا کریں۔“

”مجھے کھانا پکانا نہیں آتا۔“ دارث زبردستی مسکرا پڑا۔

”مجھے تو آتا ہے۔“ وہ برجستہ بولی۔

”آخر آپ چاہتی کیا ہیں۔“

”وہ زبردست مسکرا دی اور بولی۔

”پورا سال آپ کا انتظار کیا ہے۔“

”کیوں۔“

”آپ کی وہ تصویر جو کارٹس پر رکھی ہوئی ہے، بہت خوب صورت ہے  
میں اکثر اسے صاف کرتی رہتی تھی۔“

دارث کے ذہن کو نگینے والا جھٹکا بڑا شدید تھا۔ وہ ہولناک سا ہو گیا  
تھا۔ کیونکہ وہ بڑے واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر گئی تھی۔ وہ تپائی  
پر جھکی ہوئی بہ تن سمیٹ رہی تھی اور دارث اس کی پشت پر نظریں جمائے  
اسے گھورے جا رہا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا جیسے وہ آسمان  
سے اتری ہو۔ بہت سی خوب صورت ہو۔ اور وہ جو ایک مدت سے  
پیا سا چلا آرہا تھا۔ اس کی پیاس دو چند کر گئی ہو۔ وہ جیسے ہی برتن  
ایک طرف رکھ کر اس کی طرف مڑی، دارث غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے  
اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں عجیب طرح

کا ندیدہ پن تھا۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا تھا اور وہ اپنی جگہ سمٹ  
 گئی تھی۔۔۔ جیسے کبوتر باز کو دیکھ کر کبوتر اپنی جگہ سمٹنا شروع کر دیتا ہے۔  
 وہ بھی سمٹی تھی اور وارث بائیں اس کے قریب چلا آیا تھا۔۔۔ اس قدر  
 قریب کہ اس کے دونوں ہاتھوں کے پاسے میں زہرہ کا چہرہ تھا۔ وہ  
 اس کی آنکھوں میں دیکھے بارہا تھا۔۔۔ اور وہ پاک جھپکائے بغیر سہمے سہمے  
 انداز میں اسے ننگے جا رہی تھی۔۔۔ پھر اس نے وارث کی وحشت سے گھبرا  
 کر کچھ کہنے کے لئے لب کھولے۔۔۔ بول کی کلیاں دا ہوئی تھیں، لیکن  
 آواز نکلنے سے پہلے ہی وارث کے ہونٹ ان پر آچکے تھے۔ مدت سے  
 بہار کا جھونکا نہیں آیا تھا۔۔۔ رات کی کوکھ سے صبح بہاراں کی شبنم نہیں ٹپکی  
 تھی۔۔۔ بڑی مدت بعد جب زہرہ کے ہونٹوں کی پکھڑیوں پر مہذبات کی  
 اوس بڑی تو اس کے حلق سے ایک لطیف سی کراہ نکلی۔۔۔ اور وہ جو  
 بے نام سی جدوجہد کر رہی تھی، وہ بھی بھول گئی اور وارث کے بازوؤں  
 میں جھول کر رہ گئی۔ شاید دونوں پیاسے تھے۔۔۔ اس سے پہلے کہ وحشت  
 میں تمام تار ٹوٹ جاتے، وارث جیسے خود ہی ہوش میں آگیا۔۔۔ کیونکہ  
 طوفانوں کی سرسراہٹ اور ان کی گونج وہ اپنے پورے وجود میں سن رہا  
 تھا۔۔۔ احتیاط لازم تھی۔۔۔ حالانکہ زہرہ مجسم سپردگی کی علامت بن کر اس  
 کے اندر جذب ہو گئی تھی۔ لیکن وارث تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس

نے زہرہ کی طرف دیکھا اور خفیف سا ہو کر بولا۔

”آئی۔ ایم سوری۔“ اس کے معذرت کے انداز میں عجیب سی

ندامت تھی۔

زہرہ کچھ نہ بولی تھی۔ بس اسے تکے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں

چھلتے ہوئے جذبات کی سرخ سی لکیر تھی۔

”شکریہ۔“ زہرہ کے ہونٹ نیم وا ہوئے اور ایک مترنم سی سرگوشی

فضا میں ترنم بکھیر گئی۔ وہ مزید بولی۔

”سال بھر کے انتظار کا انعام خوب صورت تھا۔“ اتنا کہہ کر وہ

برتن وہیں چھوڑے اڑن چھو ہو گئی۔

وہ تو پہلی گئی لیکن اپنے بدن کی خوشبو وہیں چھوڑ گئی۔۔۔ وارث

بے دم سا ہو کر صوفے پر گر گیا تھا۔ سامنے بیڈ پر بڑی خوب صورت

سی چادر بھی ہوئی تھی۔ اور وارث کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس چادر

کو اس نے کبھی نہیں خریدا تھا۔ ایک طرف لحاف تہہ کیا رکھا تھا۔

خوب صورت تکیہ تھا جو بڑے سیلفے سے رکھا گیا تھا۔ اور وہ بھی اس

کا اپنا نہیں تھا۔

وارث کو یوں محسوس ہوا جیسے وہی اس کی منزل ہو۔ جو اس

کے اندر آگ لگا کر بھاگ گئی تھی۔ جو مزید پیاس بیڈ کا گئی تھی۔ وہ

اٹھا تھا اور ریوا اور جواں لوگوں سے چھینا تھا، تیکے کے نیچے رکھ دیا۔  
 ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ دروازہ بند کر دیتا۔ لیکن بچانے کیوں اسے  
 احساس ہو رہا تھا جیسے وہ پھر آئے گی۔ اور اپنے وجود کی تمام تر عنایاں  
 اپنے سینے بدن کی تمام خوشبو اور حرارت اس میں آکر جذب کر دے گی۔  
 لیکن وارث کے انداز سے غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ نہیں آئی تھی۔ اور  
 وارث نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اسے شیخ امان اللہ سے بھی خطرہ  
 تھا کیونکہ وہ کتے کی دُم پر پاؤں رکھ چکا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سوتے  
 میں دشمن فائدہ اٹھا جائے اور اسے اس رات کی صبح دیکھنا نصیب نہ ہو۔  
 سردرات کے بارہ بج گئے تھے اور وہ جاگ رہا تھا۔ اس کی  
 آنکھوں کی پگڈنڈیاں سوئی پڑی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے اسے خیال آیا  
 کہ وہ بیوی کی امانت میں خیانت کا مرتکب ہونے والا ہے۔ وہ اس کا  
 حق کسی دوسری عورت کو دینے والا ہے۔ اور اس سوچ نے اسے  
 پریشان کر دیا۔ پھر وہ کب سویا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ کافی  
 دیر بے حس و حرکت بستر پر لیٹا رہا۔ پورے سال بعد وہ نرم و گداز بستر  
 پر سویا تھا۔ کس قدر راحت تھی اس بستر میں۔ اس نے سوچ لیا  
 تھا کہ وہ اب جیل نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ کالا دھندہ ہی نہیں کرے گا۔

وہ اٹھ کر ہاتھ میں چلا گیا۔ تازہ پانی سے اس نے غسل کیا تھا۔  
 پھر کچھ سوچ کر اس نے داخلی دروازے کا لاٹکھول دیا۔ اور سیدھا  
 کچن میں چلا آیا۔ جب اس نے سامان چیک کیا تو اسے وہاں ضروریات  
 کا سامان دیکھ کر قطعی حیرت نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ مسکرا پڑا تھا۔ صاف  
 سٹورے بہن اور ہر شے ترپنے سے رکھی ہوئی تھی۔ دودھ کا ڈبہ پتی  
 چینی تک موجود تھی۔ اس نے کیتلی پکڑ کر پانی چولہے پر رکھ دیا۔ وہ  
 اپنے بے چارے تیار کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ڈبل روٹی، انڈول  
 اور مکھن پر پڑی۔ اور وہ پھر مسکرا پڑا تھا۔

”مردوں کو یہ کام زیب نہیں دیتے۔“ اچانک زہرہ کی آواز نے  
 اسے چونکا دیا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”صبح بخیر۔ رات کیسے گزری۔“

”کچھ تلخ اور کچھ حسین خیالات کے بحورم میں۔“

”کیسی تھی۔“

”پہلے گزرنے والی راتوں سے بہتر تھی۔“

”شکریہ۔“

”کس بات کا۔“

اور وہ پہلی بار شرعاً گئی۔ پھر اپنے بدن کو چراتے ہوئے بولی۔

”آپ شیو کر لیجئے۔ میں ناشتہ تیار کر دیتی ہوں۔“  
 وارث اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچن سے باہر نکل آیا۔  
 اندر سے زہرہ کی آواز ابھری۔

”باہر کا دروازہ لاک کر دیکھئے۔“

”کیوں؟“ وارث الجھ کر بولا۔

”آپ کے دوست بن بلائے اندر گھس آتے ہیں۔“ زہرہ ادبچی  
 آواز میں بولی۔ اور وارث نے غیر ارادی طور پر تیکے کی طرف دیکھا۔  
 جس کے نیچے ریوالتور رکھا ہوا تھا۔ لیکن پھر اس کی موجودگی کو محسوس  
 کر کے وہ زہرہ کی بات پر مسکرا دیا۔

وہ ہاتھ میں گھس گیا تھا۔ وہاں شیو کا سامان موجود تھا۔ اس نے  
 شیو کیا۔ روشن استعمال کیا اور جب باہر نکلا تو زہرہ جھوٹی سینٹر ٹیبل پر ناشتے  
 کے برتن چن رہی تھی۔

”غسل صحت اور آزادی مبارک ہو۔“ زہرہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے  
 دھماکہ خیز انداز میں بولی۔ اور وارث یوں سیدھا ہوا جیسے موٹے  
 سے بیدار ہوا ہو۔

”کیا مطلب۔“ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اور وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ بڑی شرمیلی تھی۔ جیسے کہہ رہی



ہو میں نے تم پر طنز نہیں کیا۔ اس کی کٹورا ایسی آنکھیں آہستہ آہستہ اوپر اٹھیں اور وارث پر جم گئیں۔

”آپ بات کو ابھاکر کیوں کرتی ہیں۔ اگر کچھ کہنا ہے تو کھل کر کہہ دیجئے۔“

”جو کہنا تھا کل رات کہہ چکی ہوں۔“ یہ الفاظ بھرا اس نے شرما کر کہے تھے اور ناشتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”یہ سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

وارث کے ہونٹ سکڑے گئے۔ وہ بڑی سنگین خاموشی سے آگے بڑھا تھا اور ٹیبل کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”آپ ناشتہ شاید اپنے بھائی جان کے ساتھ کریں گی۔“

”اگر آپ میرا ساتھ پسند نہیں کرتے تو بھائی جان کے ساتھ کر لوں گی۔“

”چلے بیٹھ جائیے۔“

اور زبیرہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ دو چار منٹ دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ دونوں بڑی سنگین قسم کی خاموشی کے ساتھ ناشتہ کرتے رہے۔ پھر اس دل میں اتر جانے والی خاموشی کا سینہ وارث نے اپنی آواز سے چاک کیا۔ اور بولا۔

”آپ میرے بارے کیا جانتی ہیں۔“

”آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“ وہ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاکر بولی۔

”جو کچھ آپ میرے بارے جانتی ہیں بتا دیجئے۔“  
 ”میں یہ جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے انسان ہیں تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کے ملنے والے آپ جیسے نہیں۔ آپ کو انہیں سمجھانے کے لئے بار بار زحمت اٹھانا پڑتی ہے اور۔۔۔“

”بولتی رہیئے، رکیئے مت۔۔۔ وارث اسے خاموش ہوتے دیکھ کر بولا۔

”کیا یہ کافی نہیں۔۔۔“

”کچھ دیر پہلے غسل صحت اور آزادی پر مجھے مبارک باد دی تھی۔ اس کی وضاحت کیجئے۔۔۔“

”کیا میں نے غلط مبارک باد دی تھی۔۔۔؟“

”دیکھیئے آپ پھر بات کو الجھا رہی ہیں۔ میں صاف گو انسان ہوں الجھاوے پسند نہیں کرتا۔۔۔“

”اور کیا کیا پسند نہیں کرتے۔۔۔“

”پلیز ذہرہ۔۔۔!“

”نام سے پکارنے کا شکر یہ! آپ کے منہ سے اچھا لگا ہے اور رڑی

اپنا نیت تھی آپ کے انداز میں — ”زہرہ انڈے پز پھری چلاتے ہوئے  
بولی تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ بات کرنے کے فن سے آشنا ہیں لیکن کیا  
یہ زیادتی نہیں کہ آپ مجھے پریشان کر رہی ہیں —؟“  
”پوچھئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ —؟“ زہرہ سنجیدہ ہو گئی۔  
”میرے بارے کیا جانتی ہیں آپ اور مبارک باد کیسی تھی —؟“  
”آپ سال بھر کہاں رہے —؟“

”جیل میں —“ وارث صاف گوئی سے بولا۔  
”مجھے اندازہ ہو گیا تھا اسی لئے آپ کو غسلِ صحت اور آزادی کی مبارکباد  
دی تھی۔“

”اب یہ پوچھیے جیل کیوں گیا تھا —؟“  
”بڑے لوگ جاتے ہیں آپ بھی چلے گئے ہوں گے، اس میں پوچھنے  
والی کیا بات ہے —؟“

”اور آپ اس کے باوجود میری عزت کرتی ہیں —“  
”میں آپ کو پسند کرتی ہوں —“

”یہ میرے لئے اعزاز ہے لیکن آپ نہیں جانتیں کہ میں کون ہوں اور“  
”اور میں جانتا بھی نہیں چاہتی — سال بھر حواِ انتظار کرتی رہی ہوں اور“

اس انتظار کی جس قدر لذت تھی اسے اپنے اندر جذب کر چکی ہوں۔ اب جبکہ آپ واپس لوٹ آئے ہیں تو مجھے یہ جاننے کی قطعی ضرورت نہیں کہ آپ کے ماضی کا پس منظر کیا ہے — آپ کون ہیں اور کیا کرتے رہے ہیں اور اب کیا کرتے رہے ہیں — کیا ذریعہ معاش ہے آپ اور کس ذریعہ سے دولت حاصل کرتے ہیں — آپ اور جن لوگوں سے آپ کا واسطہ ہے گو وہ اچھے نہیں لیکن اس کے باوجود میں ان کے بارے میں معلوم نہیں کروں گی —

وارث مسکرا پڑا اور بولا۔

”ہر بات کا جواب آپ نے سوچ رکھا ہے —“  
 ”جی ہاں، فل تیار ہی کر رکھی ہے —“ وہ مسکرا دی۔  
 ”میری سمجھ میں یہی بات نہیں آرہی کہ آخر بن دیکھے، بن آزمائے آپ اس قدر آگے کیوں بڑھ آئی ہیں —؟“  
 ”کیا آپ کو میں پسند نہیں —؟“  
 ”بات پسند اور ناپسند کی نہیں، الجھاوے کی ہے۔ آخر میں ہی کیوں آپ کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوں —؟“  
 ”اس بات کا تعلق محسوسات سے ہے، شاید آپ نہ سمجھ سکیں کیونکہ میں ایک عورت ہوں — ایک ایسی عورت جو ایک بار دلہن بن چکی ہے۔“

جس نے شوہر کے پاس کچھ وقت گزارا ہے۔ جو جانتی ہے کہ میاں بوی  
 کے درمیان کون سی شے اہم ہونا چاہیے۔ دونوں کون سی بنیاد پر اکٹھے  
 رہ سکے اور کون سی باتیں دونوں کو زندہ رہنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔  
 ”وہ تو سب ٹھیک ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر  
 میں ہی کیوں۔“ جبکہ آپ مجھے جانتی تک نہیں۔  
 ”آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کو جانتی نہیں۔ کیونکہ پورا سال آپ  
 کو دیکھتی رہی ہوں۔“

”میری تصویر کو۔“

”ہاں ایک ہی بات ہے۔ تصویر بھی تو آپ کی ہے گو وہ بھرپور جوانی  
 کی ہے۔ لیکن ہے تو آپ کی۔ اور میں نے آپ کی تصویر کو دیکھا  
 آپ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک بار نہیں، سینکڑوں بار نہیں، ہزاروں  
 بار۔ اور مجھے ایک ہی بات نظر آئی۔“  
 ”کون سی بات۔“

”تڑپ، کرب۔ ویرانی، احساسِ محرومی اور کم مائیگی کا جاننے لیا  
 احساس۔ ان سب چیزوں نے مجھے آپ کے قریب کیا ہے کیونکہ میں  
 خود بھی ان چیزوں کی شکار رہتی اور ہوں۔“

واپس نے پریشان کن نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کپ کی

چائے حلق میں اندیل کر بولا۔

”میں باتوں میں آپ سے نہیں جیت سکتا۔“

”سچی باتیں کر رہی ہوں۔“

”اور آپ کی سچی باتوں سے میں پریشان ہو رہا ہوں۔“

”پیارے کرنا جرم تو نہیں۔ کسی کو چاہنا گناہ تو نہیں۔ پیار تو زندگی کی

حرارت کا نام ہے۔“ زہرہ پلکیں جھپک کر اور ہونٹوں پر تبسم کی کرن

سمجھا کر بولی۔

”لیکن ہمیرے نزدیک یہ سب چیزیں جرم ہیں۔ کیونکہ میں ترسا ہوا اور منزل

سے بھٹکا ہوا انسان ہوں۔ مسافروں مختلف راستوں کا۔ اور تمام

راستے اندھے ہیں۔ اس لئے اس محبت جیسی میٹھی حماقت کا مرتکب

نہیں ہو سکتا۔“

”ناشتہ آپ نے ٹھیک طرح سے نہیں کیا۔“

”بات کو بد لئے نہیں۔ میں آپ کی وجہ سے پریشان ہوں۔“

”پریشان ہونا چھوڑیے۔ جینا سیکھئے۔“

”کیسے؟“

”پھر بتاؤں گی۔“ وہ مسکرا کر اٹھ گئی اور برتن سمیٹ کر کچن میں چلی

گئی۔ وارث نے سگریٹ نے سگریٹ سلگا لیا اور صوفے کی پشت سے

ٹمک گیا تھا۔ زندگی اسے کس موڑ پر لے آئی تھی۔ ایک طرف اس کی جان لینے کے درپے کچھ لوگ تھے۔ دوسری طرف اپنے ہی گھر میں پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ اور ایک طرف یہ عورت ایک نیا کھیل محبت کے نام پر کھیلنا چاہتی تھی۔ اور وہ تین دیواروں میں بھنس کر رہ گیا تھا اور پس رہا تھا۔ ماضی ایک کرب تھا۔ ماضی ہی موت بنا ہوا تھا اور حال میں تین چیزیں سمٹ آئی تھیں۔ موت، کرب، کا نہ ہر اور محبت کا احساس۔ عجیب مشلت تھی۔ ایک نرالی تکون تھی۔ لیکن وہ وقتی طور پر تینوں کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

زہرہ جمال جب برتن رکھ کر کچن سے باہر آئی تو وارث نے سگریٹ الیش ٹرے میں سل دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اور زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کچھ ضروری کام ہیں۔ اس لئے باہر جا رہا ہوں۔“  
 ”تو جابیٹے۔ کیا چابی چابیے دروازے کی۔“ زہرہ کا لہجہ عجیب سا تھا جسے محسوس کرتے ہوئے وارث تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اس اقدام پر زہرہ کے تاثرات کیا تھے۔





وہ اپنے ہی دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ عجیب بے بسی تھی۔ وہ کافی دیر تک وہاں کھڑا دستک دینے کے لئے بھی جمع ہو رہا تھا۔ دودن قبل ہی تو وہ وہاں سے ہو کر گیا تھا۔ اور وہی دروازہ تھا جس پر دستک دینے پر اس کی بیٹی آئی تھی۔ اس کی اپنی بیٹی انا۔ وہ انا جو اپنی مفلسی پر بھی فخر کرتی تھی۔ جسے اس بات کا دکھ نہیں تھا کہ وہاں کو چائے پلانے کے لئے گھر میں دودھ پتی نہیں ہے۔ ہاں رہی انا جو اس کی بیٹی تھی۔ باپ کو اجنبی سمجھ کر اس سے الجھ پڑی تھی۔ اور اس وقت وارث پھر اسی دروازے پر کھڑا تھا جو اس کا اپنا تھا، لیکن اپنا نہیں تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا جب انا اور خرم کا گھر میں موجود ہونا ضروری نہیں تھا۔ کیونکہ ابھی صرف گیارہ بجے تھے خرم

ملازمت کے لئے کہیں دھکے کھا رہا ہو گا اور انا کالج گئی ہو گی۔ لہذا وارث  
 جانتا تھا کہ اس وقت اس کی بیوی گھر میں تنہا تھی اور وہ اس سے  
 ملنے آیا تھا۔ اس نے اس وقت کا خود تعین کیا تھا تاکہ سائرہ سے  
 باتیں کر سکے۔ اپنی باتیں — دل اور زندگی کی باتیں — گزر رہے ہوئے  
 وقت کی باتیں — اور اب آنے والے دنوں کی باتیں۔ وہ اس سے  
 معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جوانی کے کھٹن دنوں کو اور پندرہ سالوں کو اس نے  
 کس طرح گزارا — اور اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ کیا گھر کے دروازے  
 اب بھی اُس کے لئے بند ہیں یا — کھل سکتے ہیں — بہت سی  
 باتیں تھیں جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس دن تو موقع ہی نہیں تھا — انا  
 آرہے آگئی تھی۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے دستک دے ڈالی۔ پہلے مدھم اور پھر  
 فراتیز — لیکن اندر سے اُسے اپنی دستک کے جواب میں کوئی آواز  
 سنائی نہ دی۔ وارث نے چند لمحے توقف کیا — اور پھر دستک دی۔  
 لیکن اس بار اس نے ہاتھوں کی طاقت استعمال کی تھی — لیکن پھر بھی  
 اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر چند لمحوں کے بعد وارث نے دروازے  
 کے پٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا — جو کھلتا چلا گیا — وہ بڑی آہستگی سے  
 اندر داخل ہوا تھا۔ صحن اور برآمدہ ویران پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے

بڑھتا چلا گیا۔۔۔ حتیٰ کہ سائرہ کے کمرے تک جا پہنچا۔ وہی کمرہ  
 تھا جو اس کا اپنا تھا۔۔۔ جس میں وہ کل بھی بیٹھ کر گیا تھا۔  
 سائرہ سامنے کرسی پر ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ سائرہ۔۔۔ خوبصورت  
 سائرہ۔۔۔ اور وہ اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”مم۔۔۔ میں نے دستک دی تھی اور۔۔۔“  
 ”میں نے سن لی تھی اور پہچان بھی گئی تھی۔“  
 ”پپ۔۔۔ پھر کیا اجازت نہیں تھی اندر آنے کی۔“  
 ”بیٹھ جائیے۔ سائرہ کا لہجہ سہاٹ تھا اور وہ اب بھی ایک  
 ہمک وارث کو دیکھے جا رہی تھی۔

اور وارث صوفے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب سائرہ بولی۔  
 ”ایک ماں کا کردار اس کی اولاد کی نظروں میں آپ نے کل مشکوک  
 بنا دیا تھا۔ اور میرے پاس انہیں مطمئن کرنے کے لئے کوئی جواب  
 نہیں تھا۔“

”مجھے تمہاری پوزیشن کا احساس ہے۔“  
 ”اگر احساس ہے تو پھر آج۔۔۔“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش  
 ہو گئی۔ البتہ نگاہیں اب بھی استفہامیہ انداز میں وارث کی طرف اٹھی  
 ہوئی تھیں۔

”میں تمہارا شوہر ہوں ساثرہ —“

”میں نے آج تک اس سے انکار نہیں کیا — لیکن —“

”لیکن کیا —؟“ وہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدل کر بولا۔

”اپنے آپ کو میرا شوہر کہتے ہوئے تمہیں شاید احساس نہیں ہوتا ہوگا

کہ تم کیا کہہ رہے ہو —“

تب وارث نے چونک کر ساثرہ کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک وہ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”میں تمہارا مجرم ضرور ہوں، لیکن تمام قصور میرا نہیں۔ کچھ تمہارا بھی ہے۔“

”ہاں کیوں نہیں — میرا بھی ہے۔ صرف اتنا کہ میں نے تمہارے

ساتھ اور تمہارے پیدا کردہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا تھا لیکن

تم جانتے ہو — تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے جب منہ پھیرا تھا تو

تم کون سا دھندہ کر رہے تھے — سوال تمہاری، میری زندگی کا نہیں

تھا۔ اُن معصوم بچوں کا تھا، جن کے ذہن اور دل پھٹ جاتے، اور

عین ممکن تھا کہ وہ ورثے میں ملنے والے باپ کے جرائم پر چل نکلتے۔

اور وہ یہی حالات تھے جب میں نے اپنا راستہ بدل دیا تھا، اور آج

دیکھ لو کہ زندہ ہوں۔ بچوں کو بھی پرورش کیا ہے اور وہ جوان بھی ہو گئے

ہیں — اب تم سوچو کہ اگر ایک کمزور عورت گھر میں بیٹھ کر اور محنت

مشقت کر کے بچوں کا پیٹ پال سکتی تھی تو تم تو مرد تھے۔ پھر تم نے وہ راستہ کیوں اپنایا جو گھناؤنا اور مکروہ تھا۔“

”تم درست کہہ رہی ہو۔ میری غلطی تھی لیکن ذرا سوچو کہ میں نے حالات سے تنگ آکر سب کچھ کیا تھا۔ اور وہ بھی اپنے لئے نہیں، بچوں کو بھوک سے مرنے سے بچانے کے لئے۔“

”اور وہ مرے نہیں۔ زندہ ہیں، اور جوان ہو گئے ہیں۔“  
سائره تیزی سے بولی۔

”ہاں! ماشاء اللہ وہ جوان ہو گئے ہیں۔ میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟“

”ضرور کر سکتی ہوں، اگر تم مجھے میری جوانی کے پندرہ سال واپس نوٹادو تو سب کچھ سبھول سکتی ہوں، تمہارا ہر جرم معاف کر سکتی ہوں۔“  
”مم۔ میں تمہارا مجرم ہوں سائره۔! جو دل چاہے سرادے لو۔ لیکن معاف ضرور کر دو۔“

”کیا چاہتے ہو۔“ اس بار سائره کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

”میں اپنے گھر میں واپس آنا چاہتا ہوں، اور اب اس قدر قریب آکر تم سے دور نہیں رہا جاتا۔ اولاد کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔“

سائرہ ہنس پڑی — اس کی ہنسی میں عجیب سی تلخی رہ چکی ہوئی تھی، اور وارث لرزتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟“

”نہیں، تم نے کوئی غلط بات نہیں کی، بلکہ اپنا حق بتایا ہے، اور ہنسی اس لئے تھی کہ تمہیں اپنی تنہائیوں کا، اکیلے پن کا اور تھک جانے کا کس قدر احساس ہے، لیکن تم نے مجھے نہیں پوچھا کہ جوانی کیسے بتائی۔ زندگی کے کن کن طوفانوں سے گزری ہوں۔ کس کس انداز سے روز ٹوٹی ہوں اور سرد اور تنہا راتوں کو بستر پر کیسے کاٹا ہے۔“

”سائرہ — اُ وارث کے ہونٹ شدت جذبات سے لرزے۔

”وارث — تت — تم نے مجھے لوٹ لیا — مجھے عین شباب

میں مجھے توڑ دیا — اور میں ہر روز جیتی رہی اور ہر روز مرتی رہی۔ جب دل سے کراہیں نکلتی تھیں تو ہونٹ سی لیتی تھی کہ عرش سے نہ جاکر ائیں۔ کیونکہ میں تمہیں کوئی سزا نہیں دینا چاہتی تھی۔ بس یہی دعا کرتی تھی کہ جہاں کہیں بھی ہو خدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔“

”سائرہ — اُ وارث پوری جان سے لرز اٹھا۔

اور سائرہ اسی لمحے پھر بولی۔

”تم میرے شوہر ہی نہیں محبوب بھی ہو — اور محبوب کو کوئی بد دعا

نہیں دیتا —

اتنا کہہ کر سائبرہ رگ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک سرد سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹپک گئی — وارث اُسے دیوانہ وار انداز سے دیکھے جا رہا تھا۔ سائبرہ نے اپنی محبت کا اظہار کر کے اس کے جذبات کے ہر تار کو چھڑ دیا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھے، اور اُسے سینے سے لگا لے — لیکن نہ جانے کیوں وہ جرأت نہ کر سکا — سائبرہ نے ایک گہری سانس لے کر چہرہ دھیرے سے آنکھیں کھول دیں — وارث نے دیکھا کہ اُن کٹورہ سی آنکھوں میں پورے سمندر کی اوس اتری ہوئی تھی۔ اور وہ اُسے قطروں کی صورت میں بہانا نہیں چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں اور وارث ساکت و جامد کرسی پر جیسے نصب ہو گیا ہو۔ حالانکہ اُس کا پورا وجود اندر سے لرزہ بر اندام تھا۔

کچھ ساعتیں، کچھ گھڑیاں، ساکت فضا کی نذر ہو گئیں۔ تب وارث نے اپنے لرزتے ہونٹوں کو جنبش دی۔

”تم — میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میرے لئے سزا تجویز کرو سائبرہ! ورنہ میں اپنے آپ کو شوٹ کر لوں گا۔“

اچانک سائبرہ نے آنکھیں کھول دیں۔ شبہم اب بھی اس کی آنکھوں



میں منجمد تھی۔

”تمہیں اپنے آپ کو شوٹ کرنے کی ضرورت نہیں وارث — بلکہ  
زندہ رہو اور اسی طرح رہو جیسے میں نے زندہ رہتے کے لئے زندگی سے  
آنکھ پھولی کھیلی ہے۔“

”سائرہ — اوارث تڑپ اٹھا۔

”ہاں! اس طرح زندہ رہو کہ زندگی تم سے شرما جائے۔“  
”سائرہ پلینر — اوارث نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ سائرہ پھو  
بول پڑی۔

”تمہاری سہرا یہی ہے کہ اولاد کی محبت کو ترستے رہو — اور کبھی  
تمہیں اپنے گھر کی چار دیواری نصیب نہ ہو — قریب رہو لیکن ہمیں چھو  
نہ سکو اور —“

وارث ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی طرح لرز رہا تھا۔ اس  
کی ٹانگیں اس کے وجود کا بوجھ برداشت نہیں کر پا رہی تھیں — اور  
سائرہ بھی ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

”میرے دوست — میرے محبوب شوہر — مجھے اپنا پتہ  
بتا جاؤ — اگر کبھی مجھے دل پر اختیار نہ رہے تو تمہیں چند لمحوں کے لئے  
دیکھنے چلی آؤں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تم پھر اس دہلیز کو عبور کرو۔“

ورنہ بچے ناں کی طرف سے مشکوک ہو جائیں گے۔“  
 ”مجھے تمہاری سزا قبول ہے سائره۔! شاید میں اسی قابل ہوں۔  
 لیکن تم ایک بار پھر انصاف سے کام نہیں لے رہیں۔“  
 ”انصاف اوپر والا کرے گا۔ وارث۔! تیرا میرا انصاف  
 اوپر والا ہی کرے گا۔“  
 وارث نے سائره کو بتایا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پھر آہستہ  
 سے بولا۔

”میری ایک خواہش ہے، پوری کر سکتی ہو۔  
 ”کہو۔“

”میرے سینے سے لگ جاؤ۔“  
 سائره نے اپنے شوہر کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور  
 بولا۔

”خرد لگ جاتی۔ لیکن۔ وارث۔! سیکڑوں طوفان اٹھ  
 رہے ہوں گے اس نامراد سینے کے اندر انہیں کون سنبھال دے گا۔  
 میں اب کسی آن دیکھے طوفان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مجھے معاف  
 کرنا۔ تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔“  
 ”ٹھیک ہے سائره۔! میں تمہاری کسی بات کو رد نہیں کر سکتا۔“

”خدا حافظ —“ سائرہ بولی۔ اس کی آواز لرز لرز گئی تھی۔

”اچھا میں جا رہا ہوں — لیکن سائرہ جب میرا دل پھل اٹھے اور تمہارے پاس آنا چاہوں تو —“

”تو کچھ نہیں — دل کو سٹلا دینا، ایسے ہی جیسے میں پندرہ سال تک اپنے ہر ارمان — ہر جذبے کا خون کرتی آ رہی ہوں —“

”تمہارے جیسا ضبط اور حوصلہ کہاں سے لاؤں گا —“

”خدا حافظ —“ سائرہ پھر بولی۔

اور وارث لڑکھڑا کر باہر نکل آیا — جیسے زندگی کی آخری بازی بھی ہار گیا ہو — وہ جو نہی باہر نکلا۔ سائرہ نے کراہ کر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ آواز نہ ابھر سکے۔ وہ پھر اپنے لڑتے وجود کو لئے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس میں مزید کھڑا رہنے کا یارا نہیں رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹک گئی تھی اور نجانے کب تک وہیں پڑی رہی کہ — انا کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

”جہان آج بھی بغیر چائے کے چلا گیا امی —“

”کک — کون جہان —؟ سائرہ بولی۔

”وہی جو کل آیا تھا —“

”کیا وقت ہوا ہے —“ سائرہ اُسے گھور کر بولی۔

”بارہ بج رہے ہیں۔“ انا بولی۔  
 ”اور تم کالج سے اتنی جلدی کیسے آگئیں۔“  
 ”پر پڑ خالی تھا۔ چلی آئی۔ اور۔“  
 ”اور کیا۔؟“

”کچھ نہیں۔“ انا دروازے سے ہٹ گئی اور سائرہ کے دل سے ایک  
 کراہ نکل گئی۔ بیٹی نے پھر اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ شاید گلی کے  
 اندر یا باہر اس نے باپ کو دیکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اس سے کیا باتیں  
 ہوئی ہیں۔ ہوئی بھی ہیں یا نہیں یا انا نے صرف اسے جاتے دیکھا ہی  
 ہے۔ سائرہ پریشان ہو گئی تھی۔ بیٹی ایک بار پھر شکوک ہو گئی تھی۔  
 بھائی کو بھی بتائے گی۔ سائرہ کے لئے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا  
 تھا۔ وہ اب انا کا سامنا کرنے سے کتر رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ  
 اپنے شوہر سے ملی تھی۔ لیکن اولاد کو کیا بتاتی۔ انہوں نے اپنی ہوش  
 میں اپنی ماں کو کسی مرد سے ملتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو ان کے نزدیک  
 عظمت کا ایک ایسا سمبل تھی کہ وہ اس کی پاکیزگی کی قسم کھا سکتے تھے لیکن  
 اب کیا تھا۔ دیکھا جائے تو سائرہ اپنی نظروں میں خود ہی گر گئی تھی  
 آدھے گھنٹے بعد انا پھر اندر آئی تھی۔ لیکن انداز بڑا نارمل تھا۔  
 اس نے بڑے سرسری انداز میں ماں سے کہا۔

”امی! آج پورا راشن ختم ہے اٹا اور گھی بالکل نہیں ہے۔“  
سائرہ نے کنکھیوں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے لیے میز پر  
پیدا کر کے بولی۔

”کوئی نئی بات تو نہیں، اکثر ایسے دن بھی آتے رہے ہیں۔“  
”ہاں آتے تو رہے ہیں لیکن۔“

”لیکن کیا۔“ سائرہ بے چینی سے بولی۔

”میرا مطلب تھا امی! جیسا کہ ملازمت نہیں مل رہی، کہیں ایسا نہ ہو کہ  
تنگ آکر کوئی غلط حرکت کر بیٹھے۔“ انا نے شکوک کی سیاہ پکیر کھینچی۔  
”کیا مطلب۔“ سائرہ بے ساختہ چونکی۔

”غلط حرکت سے میری مراد اتنی ہے کہ کوئی جرم وغیرہ۔“

”جرم کی نوعیت بتاؤ انا۔“ تم باتیں بہت ابھی کرنے لگی ہو۔“  
”امی آپ سمجھتی کیوں نہیں۔“

”کسی طرح سمجھاؤ۔“ پریشان کر دیا ہے تم نے مجھے۔“ سائرہ اسے  
گھورتے ہوئے بولی۔

”کوئی ڈاکہ۔ چوری یا کسی کی جیب کاٹ لینا۔ یہ جرم نہیں تو اور کیا  
ہے۔“

”ہمارے دودھ پر شک کرنے لگی ہو لڑکی۔“ سائرہ جیسے چیخ

پڑی تھی۔

”مم — میرا مطلب نہیں تھا — میں دراصل —“ انا نے کچھ کہنا چاہا  
ہی تھا کہ سائرہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو وہی کہو — بھائی کی آڑ لے کر ادھر ادھر کی  
باتیں مت کرو — میرا دودھ اس قدر گندا نہیں ہے کہ اولاد کو گندے کام  
کرنے پر مجبور کر دے۔“

”مم — میرا مطلب حالات سے تھا — بھیا بہت پریشان ہیں۔ صبح  
جب وہ گھر سے میرے ساتھ نکلے تھے تو کہہ رہے تھے، یوں کب تک  
دھکے کھاتا رہوں گا — کیا بھوک کے ساتھ موت بھی مقدر ہے۔“  
”بے وقوف ہے وہ لڑکا — اگر اس نے ایسا کہا تھا تو غلط کہا تھا۔  
آنے والے بات کروں گی اس سے آج — بہت بکواس کرنے لگا ہے  
وہ — ہماری خدائے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ ہمیں یوں ذلت کی موت  
دے دے — بس ہر انسان کا امتحان ہوتا ہے — اور ہمارا بھی ہو رہا  
ہے۔“

”پندرہ سال سے مسلسل امتحان آتی — اس قدر اذیت ناک امتحان —  
برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو لڑکی، ہوش میں آؤ —“ سائرہ نے بیٹی کو

تیز نگاہوں سے گھورا اور اناخاموشی سے باہر نکل گئی۔

”اُف میرے خدا — کیا ہو گیا ہے اس بڑی کو —؟ کسی باتیں کرنے لگی ہے یہ —؟ اب کیسے سمجھاؤں اسے کہ تیری مال نے زندگی کا ہر ورق اپنے خون سے لکھا ہے —؟ پھر کافی دیر تک وہ الجھتی رہی اور پریشان ہوتی رہی — ایک بیٹی نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا اور اوپر سے گھر میں آج فاقہ تھا۔

تقریباً ایک بجے خرم اس کے پاس پہنچا تھا — اور بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

سائہ نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”لازمت مل گئی ہے کیا —؟“

”ہال آئی مبارک ہو — آخر تلاش کر لیا میں نے اسے —“

”تمہیں بھی مبارک ہو — جاؤ پہلے بہن کو یہ خوشخبری سناؤ۔ بڑی

انٹرنٹ بک رہی تھی۔“

”کیا کہہ رہی تھی —؟“

”کچھ نہیں — تم یہ بتاؤ کہ لازمت کیسی ہے اور تمہیں کیا کرنا پڑے گا؟“

”امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم ہے امی! مشینیں پہ زہ جات باہر ملکوں سے

منگواتے ہیں وہ لوگ —“



”کیا تنخواہ ہے —؟“

”دو ہزار روپیہ — اور یہ پورا ہزار روپیہ انہوں نے ایڈوائس دے

دیا ہے —“

”ایڈوائس اور پورا ایک ہزار روپیہ —؟“ سائرہ چونکی۔

”کیوں اتنی —؟ آپ پریشان کیوں ہو گئیں —؟“

”عجیب لوگ ہیں وہ جو انہوں نے تمہیں یوں پیسے دے دیئے۔ مجھے

آج تک کسی نے ایک قمیص کی سلاخی ایڈوائس نہیں دی اور تمہیں —“

”اوا تمی! وہ بہت اچھے لوگ ہیں — بہت دوست مند ہیں۔ میں نے

انہیں جب اپنی مالی پوزیشن بتائی تو بہت متاثر ہوئے — اور انہوں نے

مجھے ایڈوائس رقم دے دی اور یہ رقم وہ ہر ماہ دو صد روپیہ کے حساب

سے کاٹا کریں گے — اور اب یہ پیسے لیجئے اور خرچ کر ڈالئے انہیں۔

تنگدستی کے دن ختم ہو گئے جو لوٹ کر اب کبھی نہیں آئیں گے — اور

میری پیادہ سی ماں کو مشین کو مزید اپنا خون نہیں پلانا پڑے گا —“

خرم سائرہ کو شانوں سے پکڑ کر مزید بولا۔

”اٹھو ماں! آج تیرا بیٹا جوان ہو گیا ہے اور اس کی زندگی کی پہلی کمائی

گھڑائی ہے — کچھ کرو ماں —“

سائرہ ہبکرا دی — پھر آہستہ سے بولی۔

”جاؤ بہن سے معلوم کرو کہ اسے کیا کیا چاہیے۔ اور گھر میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔“

”ہاں، یہ بات ٹھیک ہے۔“ خرم اتنا کہہ کر مسکرایا اور پھر پانچ صد روپیہ اس نے سائرہ کے سامنے رکھ دیا اور باقی رقم لے کر باہر نکل گیا۔

”بب۔۔۔ بائکل باپ پر گیا ہے۔۔۔ وہی جوشیلہ پن۔۔۔ وہی بات کرنے کا انداز۔۔۔ اور میرے سامنے پیسے رکھ کر وہی خوشی کا اظہار۔۔۔ ہاں ہر بات، ہر انداز اس نے باپ کا اپنا یا ہے۔“

پھر انکدیم اسے کسی خیال نے برزا دیا۔۔۔ اور وہ خیال تھا مجرمانہ زندگی کا۔۔۔ جس کی طرف انا اشارہ کر گئی تھی۔۔۔ اس نے رزقی نگاہوں سے پیسوں کی طرف دیکھا تھا۔۔۔ پھر خود بخود ہی بڑبڑا اٹھی۔

”نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ باپ کی طرح میرا بیٹا کوئی مجرمانہ حرکت نہیں کر سکتا۔۔۔ میری تربیت اتنی گھٹیا نہیں ہو سکتی۔۔۔ ہاں ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ میرا بیٹا اپنے باپ کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا۔۔۔“

سائرہ نے اپنے آپ کو تسلی دی۔۔۔ زندگی اب اسے کسی نئے امتحان میں نہیں ڈال سکتی تھی۔۔۔ وہ بہت کھیل چکی تھی اپنے آپ سے، ضرورت سے زیادہ ٹوٹ چکی تھی حالات کے ہاتھوں۔۔۔ اس نے روپے اٹھا کر

مسٹی میں بند کر لئے تھے اور اپنے آپ کو تسلی دی تھی کہ — اب حالات بدل جائیں گے — وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے — اس نے مدد کے بغیر — اپنی اولاد کو پرورش کر لیا ہے — اپنی خون پسینے کی کمائی سے اور اس کمائی میں حرام کا ایک لقمہ بھی شامل نہیں تھا۔

دوسری طرف خرم انا کے سامنے پانچ سو روپیہ رکھے کہہ رہا تھا کہ ”اب بناؤ بجٹ — کیا کیا چاہیے تمہیں — پورے ماہ کاراشن ڈال لو گھر میں اور جو پیسے بچیں ان میں اپنا بجٹ بناؤ کیا کیا چاہیے تمہیں — پورا ہزار لانا ہوں — پانچ نوٹ امی کو دے آیا ہوں — اور پانچ یہ پڑے ہیں —“

انا سنس پڑی — اور اس کی سنسی میں آنکھوں کی نمی بھی شامل تھی اور یہ خوشی کے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں میں چھلک آئے تھے — پھر وہ محبت بھری نظروں سے خرم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
”کس غریب کی جیب کاٹ لائے ہیں آپ بھیا —“

”ایک دولت مند کی — جس کے پاس بہت پیسہ ہے۔ اپنے حالات بتا کر ایڈوانس لے لیا اس سے — ہر ماہ دو ہزار لایا کروں گا۔ نقد بدل دوں گا سب کا —“

”سبارک ہو بھیا — اور پھر سب سے پہلے تو تمہیں تذر و نیاز دینا چاہیے

خدا کا شکر بجالانا چاہیئے۔ کچھ باتنا چاہیئے بھیا۔ کیوں کیا خیال ہے؟  
 کچھ لپکا کر باتنا چاہیئے یا پھر پھل وغیرہ لایا جائے۔  
 ”جو کہو۔ ویسے پھل وغیرہ ہی ٹھیک رہے گا۔ بولو کیا خیال ہے۔“  
 ”جو آپ کا خیال ہے بھیا۔“

پھر دونوں مسکرا دیئے۔ خوشی کا یہ پہلا تاثر تھا جو اس گھر کے اندر  
 پیدا ہوا تھا۔ روشنی کی یہ پہلی کرن تھی۔ جو اس اندھیرے گھر میں  
 پھوٹی تھی۔



وارث کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکا سا وجود اور روح لئے  
 اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔ وہ سارا دن آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔  
 سائے سے ملنے کے بعد اس کے اندر زندہ رہنے کی ہر قسم کی آزمودہ  
 گئی تھی۔ اسے اپنی زندگی سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ سائے نے  
 اس سے جو انتقام لیا تھا وہ اسے جینے نہیں دے گا۔ کیسا نہ ہر تھا کہ  
 وہ اپنی اولاد کو نہیں مل سکتا تھا۔ یہ کیسی سزا تھی۔ جو اس نے دی  
 تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ زندہ رہوں اور دھواں چھوڑتا رہوں۔ اولاد  
 کو دیکھ دیکھ کر ترستا رہوں اور آگے بڑھ کر انہیں سینے سے نہ لگا  
 سکوں۔

عجیب عورت تھی، دنیا سے نرالی۔

وہ آہستہ آہستہ سے قدموں سے فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے وہاں نہر

جمال کے ساتھ اس کا بھائی تو قیر خاں بھی نظر آیا — جو وارث کو دیکھ کر  
چھبک کر بولا۔

”آٹھ — میاں وارث! آپ کہاں گم ہو گئے تھے؟“

”آپ کیسے ہیں خاں صاحب؟“

”ہم تو ٹھیک ہیں اور امید ہے ٹھیک رہیں گے — لیکن یہ آپ پورا  
سال کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”حالات — جناب —“

”کہیں باہر پیدیس وغیرہ چلے گئے تھے؟“

”بس کچھ ایسا ہی سلسلہ تھا۔“

”میاں اپنی زمین اپنی ہوتی ہے — اس سے پیار کرنا سیکھے —“

”بختر زمین اچھی نہیں لگتی جناب — جو فصل ہی نہ دے سکے، اس زمین

کا کیا فائدہ؟“

”خوب کہا آپ نے — بہر کیف ہم جلدی میں ہیں پھر کبھی بات کریں

گے — اور ہاں اس فلیٹ پر جو ہماری بہن نے قبضہ جما لیا تھا، اس کی

ہم معافی چاہتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں تو قیر صاحب — بلکہ میں آپ لوگوں کا مشکور ہوں کہ

آپ نے میرے سامان کی حفاظت کی۔“

خان توقیر نہیں پڑے اور بوسے۔

”اچھا بھئی پھر میں گے۔ اور خوب باتیں ہوں گی۔ اس وقت جلدی میں ہیں۔“ اتنا کہہ کر خان توقیر نے وارث سے ہاتھ ملایا اور فلیٹ سے باہر نکل گئے۔ تب وارث نے زہرہ جمال کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔

”آپ آتے ہی کاروبار میں مصروف ہو گئے ہیں۔ میرا خیال تھا آپ دوپہر کا کھانا گھر کھائیں گے۔“

”ضروری نہیں کہ آپ کا ہر خیال درست ہو۔“ وارث اتنا کہہ کر صوفے پر لیوں بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔ اس نے پشت سے ٹک کر آنکھیں بند بند کر لی تھیں۔

”کھانا لگاؤں۔“ زہرہ جمال کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اور وارث ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں تک زہرہ جمال کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک بولا۔

”میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہیں اسے جلد سمجھ لینا چاہیے۔“

”بہ کی بات کہنا چاہتے ہو کوئی۔“ زہرہ زبردستی بکرائی تھی، لیکن وارث سمجھ رہا تھا کہ اس کی مسکراہٹ میں دم نہیں تھا۔ وہ زبردستی



مسکرا اٹھی تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ بُری ہو۔ لیکن میرے نزدیک اتنی بُری نہیں کہ تم بُرا مان جاؤ۔“

وارث نے پہلی بار اسے آپ سے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔  
”مت کہو کچھ اور اگر ضرور کہتا ہے تو پہلے کھانا کھا لو۔“ کیونکہ میں نے دوپیر سے کچھ نہیں کھایا۔“

”یہ میرے ساتھ نہ یادتی ہے۔“ وارث پہلو بدل کر بولا۔  
”لیکن مجھے انتظار میں جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کا شاید تم تصور نہ کر سکو۔ میں نے پہاڑ ایسی زندگی تنہا گزار کا ہے۔ کیسے کاٹی ہے اور کیونکہ کٹی ہے، تمہیں اس کا احساس نہیں۔“ آؤ پہلے کھانا کھا لو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لئے کوفتے بنائے ہیں۔“

کس قدر جاہت تھی اس کے انداز میں جسے وارث رد نہ کر سکا حالانکہ وہ ہوٹل سے تھوڑا بہت زہر مار کر آیا تھا۔ لیکن اب اسے یہ بتا کر آزرہ نہیں کرنا چاہتا تھا لہذا ہتھیار ڈال دیئے اور جو کچھ کہنا چاہتا تھا اسے پھر کسی وقت کے لئے رکھ دیا۔

زہرہ کچن میں چلی آئی تھی۔۔۔ نے سالن گرم کیا اور پھر چھوٹی تپائی پر برتن چن دیئے۔۔۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے اور پھر

اچانک وارث بولا۔

”خان صاحب تمہیں کچھ کہتے نہیں۔“

”نہیں۔ کیونکہ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ کیا چاہتی ہوں۔“

”کیا چاہتی ہو۔“

اور وہ مسکرا دی۔ بڑی میٹھی سی مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر

پھر آہستہ سے بولی۔

”میں آج تمہیں اپنے بارے کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

”کوئی خاص بات ہے کیا۔“

”شاید تمہارے لئے ہو۔ اور دیکھا جائے تو میرے لئے بھی ہے۔“

لیکن میں کیونکہ ایسی زندگی کی عادی ہو گئی ہوں اس لئے حالات سے اس

قدرت سے سمجھوتا کر لیا ہے۔“

”چلو بات شروع کرو۔“

زہرہ جمال چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی پھر ایک گہری سانس لے

کر بولی۔

”مم۔۔۔ میں بخیر ہوں۔“

”کیا مطلب وارث چونکا۔“

”اولاد پیدا نہیں کر سکتی۔ ایسی زمین ہوں جس پر کبھی کوئی فصل پیدا

نہیں ہو سکتی۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اور وارث نے دیکھا  
اس کے چہرے پر کرب سمٹ آیا تھا۔ دکھ اور بے چارگی کا ایسا سایہ  
تھا کہ وہ خود پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنا کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا  
تھا۔

”تم کھاؤ، رک کیوں گئے۔۔۔“

”مجھے دکھ ہوا۔۔۔“

”مجھے یقین تھا کہ تمہیں دکھ ہو گا۔ لیکن تم سے اپنے لئے رحم کی

بھیک نہیں مانگوں گی۔۔۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔۔۔“

”مطلب۔۔۔“ وہ لفظ ”مطلب“ کو ہونٹوں تلے دبا کر بولی۔

”میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہو سکتا ہے تمہارے نزدیک قابلِ رحم اور  
قابلِ توجہ ہوں۔ لیکن ترس کھا کر مجھے پیار مت کرنا۔ ورنہ میں دم گھٹ  
کر مر جاؤں گی۔ میں نے زندگی کے ڈھیروں سال کرب کی صلیب پر  
لٹک کر گزارے ہیں۔ ہر مرد و اولاد چاہتا ہے اور میں اولاد پیدا نہیں کر  
سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں مردوں سے دور رہی ہوں۔ لیکن اس کے  
باوجود کسی ساتھی کے لئے ترستی رہی ہوں۔ عورت ہونے کے ناطے  
میرے اپنے جذبات ہیں احساسات ہیں اور یہ سب فطرت کا انعام ہے۔ لیکن

اس انعام سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بس تڑپتی رہی ہوں اور سرور آٹوں میں تنہا بستر پہ کروٹیں بدلتی رہی ہوں۔ اور اب بچانے کیوں ان دیکھے، اور انجانے راستے پہ نکل کھڑی ہوئی ہوں۔ شاید جذبات بغاوت اور سرکشی پر اتر آئے ہیں۔ اور میں نے پورا سال آپ کی تصویر کو چاہا ہے۔ ایسا میں نے کیوں کیا، خود بھی نہیں جانتی۔ بس سب کچھ انجانے میں ہو گیا۔ اس لئے میرے بارے کوئی فیصلہ کرنے سے قبل میری بے چارگی۔ اور کم ہائیکگی کا خیال ضرور کر لیتا۔ ترس مت کھانا۔ البتہ وقت اور حالات کے دیئے ہوئے زعموں کا تجزیہ ضرور کرنا تاکہ تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔

”کھانا کھاؤ۔“ وارث نے سکرانے کی کوشش کی۔  
 ”تم بھی تو کھاؤ، نا۔“

اور وارث نے اپنا ہاتھ کھانے کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خود بھی کھا رہی تھی آہستہ آہستہ۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا۔ اور اس شے کو وارث بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد ہی دونوں فارغ ہو گئے۔ ہاتھ روم سے ہاتھ دھو کر جب وارث دوبارہ صوفے پر آکر بیٹھا تو زہرہ نے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ دیئے تھے وہ اس وقت افسردہ افسردہ سی لگ رہی تھی۔

”ہاں اب کہہ کیا کہنا چاہتے ہو۔“ وہ استفہامیہ انداز سے وارث

کی طرف دیکھتے ہوئے بولی اور وارث جو دل میں ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا کہ اب وہ بات نہیں کرے گا جو کرنا چاہتا تھا کیونکہ جو کہانی زہرہ نے اُسے سنائی تھی اب اُسے خود کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حالانکہ وہ اُسے بتا دینا چاہتا تھا کہ جس وارث کو تم لاوارث جان کر اپنے دل میں بٹھا چکی ہو وہ دونو جوان بچوں کا باپ اور ایک خوبصورت بیوی کا شوہر ہے۔ لیکن اُس نے ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زہرہ کو اپنی طرف سے کوئی دکھ دے۔ وہ تو پہلے ہی اُس کی طرح دکھوں کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب زہرہ نے اُس سے استفہام کیا تو وارث ہلکے سے مسکرا دیا اور بولا۔

”اب تو صرف یہی کہوں گا کہ ہم دونوں کی کہانی تقریباً ایک جیسی ہے۔ لہذا کچھ کہنا سنا بیکار ہے۔“

”کیوں! بیکار کیوں ہے۔“

وارث نے سگریٹ سلگالیا اور اُس کا گہرا کش لے کر بولا۔  
”تم نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے اُس کے بارے میں صرف یہ کہوں گا کہ تم نے جلد بازی سے کام لیا۔ میں مچھولی اچھا انسان نہیں ہوں کہ تمہیں وہ خوشیاں دے سکوں جن کی تم خواہش رکھتی ہو۔“

”میرے جانتے والے اچھے لوگ نہیں ہیں۔ میرا کاروبار اچھے لوگوں کے ساتھ نہیں ہے اور دوبار تمہیں اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ تم دیکھ چکی ہو کہ میرا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔“

”ایسے لوگوں کو چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔“ زہرہ بولی۔

”ہاں کیوں نہیں۔ ضرور چھوڑا جاسکتا ہے، لیکن وہ مجھے نہیں چھوڑے۔ میں اُن کا کچھ مال کھا گیا ہوں اور وہ وصول کرنا چاہتے ہیں اور میں دینا نہیں چاہتا۔“

”کیسا مال۔“ زہرہ بولی۔

”سات لاکھ کا مال۔ اور وہ مال اچھا نہیں اور میں نے اُس کے لئے پورا سال جیل کاٹی ہے اور اُن لوگوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب میں باہر آ گیا ہوں تو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور ملنا اس لئے چاہتے ہیں کہ اُن کا مال میرے پاس ہے، جو میں نے پولیس کو بھی نہیں بتایا تھا۔“

”جیل میں ماننے لیتی ہوں کہ تم ٹھیک راستے پر ہو، لیکن وارث یہ تو سوچو کہ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

”اسی لئے میں یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے اور پھر انہوں نے یہ جگہ دیکھ رکھی ہے۔ کسی وقت



بھی چڑھ دوڑیں گے مجھ پر۔۔۔

ایک بات کہوں۔۔۔ "زہرہ آکے کی طرف جھکتے ہوئے بولی اور اور وارث نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں بند کمرے کی فضا میں چھوڑ دیا۔

"تم ایسا کرو کہ وہ سارا مال انہیں ٹوٹا دو۔ میرے پاس بہت پیسہ ہے۔ اتنا تو نہیں جتنا تم نے اُن لوگوں کا دبا رکھا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ تم اس سے کوئی خوبصورت کاروبار کر سکو۔ پھر کس قدر خوبصورت زندگی ہوگی۔"

"زندگی تب بھی اتنی ہی روگی ہوگی جتنی اب ہے۔" وارث نے زہرہ کا جھکدرمیان میں ہی اچک لیا۔  
 کیا مطلب۔؟ "زہرہ پریشان ہو کر بولی۔

"وہ لوگ پھر بھی مجھے جینے نہیں دیں گے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اب یہاں رہ نہیں سکتا۔ کیونکہ اُن لوگوں کا بھیدی ہوں۔ اور ایسے لوگ داند داروں کو سب سے پہلے گولی مارا کرتے ہیں۔"

"کالا دھندہ کرتے ہو؟"

"ہاں میں کالا دھندہ کرتا ہوں، اور تمہیں ایک بات اور بتا دوں کہ ایسے لوگوں کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔"



تم مجھے کیوں خوفزدہ کر رہے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے میں تمہیں  
 چھوڑ دوں گی یا تمہارا خیال دل سے نکال دوں گی۔ نہیں وارث  
 ایسا نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہی نہیں۔ اگر قسمت میں ہی ہے اور یوں  
 ہونا نصیب میں ہے تو پھر یونہی ہی۔ لیکن تم رہو گے یہیں پر۔“  
 وارث نے ایک گہرا سانس لیا اور صوفے کی پشت سے ٹک  
 گیا۔ زہرہ اٹھ کر اُس کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اس قدر قریب کہ وارث  
 کو اس کے گرم گرم سانسوں کا لمس اپنی گردن پر محسوس ہو رہا تھا۔  
 ”م۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں وارث! اور میرا خیال ہے یہ  
 تھوڑی سی زندگی اگر پیار کرتے گزر جاتے تو سو ڈھنگا نہیں۔ م۔  
 میں تشنہ لب ہوں۔ بہت پیاسی ہوں وارث! اچھی زندگی کو  
 اپنانے کے لئے کچھ سوچو۔ میں اب کسی اور مرد کو اپنانے کے  
 لئے از سر نو کوشش نہیں کر سکتی۔“

وارث نے اپنا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھ دیا، اور زہرہ اُسی  
 وقت وارث کے سینے سے آنگی۔ اور وارث نے اُسے اپنے  
 ساتھ لگا کر بچھ لیا۔ شاید اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا

تھا۔



وارث نے مال اپنے ایک دوست کے ہاں رکھ چھوڑا تھا۔  
اور اس دوست کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اُس بریف کیس میں کیا ہے  
جو ایک سال سے اُس کے پاس رکھا ہوا ہے۔ وارث بڑے  
محتاط انداز میں وہاں تک پہنچا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیخ  
امان اللہ کے آدمی اس کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک آپہنچیں۔  
اُس نے رات کے اندھیرے میں بریف کیس حاصل کیا اور خاموشی  
سے واپس لوٹ آیا۔ بریف کیس کو پورا سال سنبھال کر رکھنے والے  
کو قطعاً نہیں معلوم تھا کہ وہ سینکڑوں انسانوں کی موت کو سنبھالے ہوئے  
ہے۔ وارث اُس کا شکریہ ادا کر کے بریف کیس لے آیا تھا، ٹیکسی  
اس نے گلی کے باہر چھوڑ رکھی تھی۔ اس نے وہاں پہنچ کر بریف کیس  
اندھ رکھا اور ڈرائیور سے بولا۔

”مارٹن روڈ کی طرف چلو۔“

ٹیکسی اندھیرے کا سینہ پیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ وارث نے اور کوٹ کے بڑے بڑے کالر کھڑے کر رکھے تھے پیشانی پر فلیٹ ہیٹ جھکا رکھا تھا۔ بریف کیس اس نے اپنے ساتھ ہی سیٹ پر رکھ چھوڑا تھا۔ ٹیکسی بڑی تیز رفتاری سے راستہ چاٹ رہی تھی۔ مارٹن روڈ کے کرائنگ کو عبور کرتے ہوئے وارث نے ڈرائیور کو

ہدایت دی

”اگلے چوراہے سے سیدھے ہاتھ کاٹ لینا۔“

”بہت اچھا جی۔“ ڈرائیور بڑے ادب سے بولا تھا شاید

وہ وارث کی پراسرار شخصیت سے مرعوب ہو چکا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ایک بلڈنگ کے سامنے وارث نے ٹیکسی رکوالی۔ کرایہ ادا کیا اور بریف کیس لئے خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ پیدل چلتا رہا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی اور وارث

پھر پیچھے کی طرف لوٹ آیا تھا۔ وہ پورا ایک فرلانگ پیدل چلا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ سڑکیں ابھی اس قدر ویران

نہیں ہوئی تھیں کہ بے رونق ہو جائیں۔ تقریباً دس منٹ چلنے کے بعد وارث ایک بنگلے کے گیٹ پر جا پہنچا تھا۔ اس نے کال بل کے سن

پر انگلی رکھ دی۔۔۔ دیر کہیں گھنٹی کی آواز ابھری تھی۔ پھر کچھ دیر بعد آواز ابھری۔

”کون —“

”وارث —“

”آجائے —“ آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور وارث اندھیرے ہنگلے میں برف کیس لئے اندر داخل ہو گیا۔ ایک ہاتھ اُس کا کوٹ کی جیب میں تھا، جہاں ریوالور کے دبستے پر اس کی گرفت تھی، جو بوقت ضرورت استعمال کر سکتا تھا۔ پورے ہنگلے میں صرف برآمدہ روشن تھا یا پھر ایک بالائی منزل کا کمرہ جس کے شیشوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی، ورنہ ہر طرف خاموشی اور اندھیرے کا راج تھا۔ وارث ایک اجنبی چہرے کی رہنمائی میں بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ جس کے زینوں میں زیر و کابلب اپنی محدود روشنی لئے ہوئے تھا۔ پھر کچھ لمحوں بعد وارث کو اُس کمرے کے سامنے پہنچا دیا گیا جو باہر سے بھی روشن نظر آ رہا تھا۔

”اندر شریف لے جائیے مشر وارث! باس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

اجنبی بڑے ادب اور اخلاق سے بولا — اور وارث برف

کیس لئے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایک خوبصورت کرسی پر ایک پچاس سالہ انسان اپنی چمک دار آنکھوں سے وارث کی طرف دیکھ رہا تھا۔

خوش آمدید مسٹر وارث! ہم بہت مشکل سے تمہیں ملنے کے لئے وقت نکال پاتے ہیں۔ آؤ بیٹھو اور اس تعین کے ساتھ بیٹھ جاؤ کہ تم دوستوں میں موجود ہو۔ جب تک کوئی انسان ہمارے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو اسے ہم سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔“

”شکریہ مسٹر خان۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں اور پھر دوست اور دشمن میں تمیز کر سکتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مال چمک کر لیجیے۔“

بوڑھا مسکرایا۔ اور بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔

”لاؤ مسٹر وارث۔ اس بوجھ کو ہمیں دے دو۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مال کتنا ہے۔“

وارث نے بریف کیس بوڑھے کی طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی چابی بھی۔ جسے کھول کر دیکھا گیا۔ اندر سفید رنگ کا سفوف پلاٹک کے لفافوں میں بند تھا۔ ایک لفافے کو کھول کر خان نے سفوف کو چمک کیا، وہ بڑی باریک بین نگاہوں سے ایک ایک

لفافے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر اس نے بریف  
کیس بند کر دیا۔ — اور وارث سے بولا۔

”ٹھیک ہے سٹروارث! تمہارا مال ٹھیک ہے۔ —“ اتنا کہہ کر وہ  
اٹھ کر ایک الماری کی طرف بڑھا۔ اسے کھول کر ایک سیاہ رنگ کا بریف  
کیس نکالا اور لا کر اسے وارث کو دیا۔

”پورا سات لاکھ ہے سٹروارث۔ — اور یہیں امید ہے کہ ہم پھر اس  
طرح ملتے رہیں گے۔ —“

”کیوں نہیں سٹرخان۔ — اگر سودا ایمان داری سے ہوتا رہا تو ضرور ملاقات  
ہوتی رہے گی۔ — میرے ہاتھ پھر جیسے ہی کوئی مال لگا سب سے پہلے تمہیں  
اطلاع دوں گا۔ —“

اتنا کہہ کر وارث نے بریف کیس کھول کر ایک نظر اندر ڈالی اور پھر مطمئن  
ہو کر اسے بند کر دیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ واپس ہو رہا تھا۔ اس نے مال  
سے اپنی جان چھڑالی تھی۔ ایک دوسری پارٹی کو شیخ امان اللہ سے ہتھیایا  
ہوا مال دے دیا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے باہر نکل آیا تھا۔ — پھر وہ  
جس قدر احتیاط کر سکتا تھا، وہ بریف کیس کو سنبھال کر واپس لوٹ آیا۔ زہرہ اس  
کی منتظر تھی۔ — گیارہ بج رہے تھے۔ — اس نے کمرے میں ہیٹر لگایا ہوا  
تھا۔ — جس سے پورا کمرہ گرم ہو رہا تھا۔ — اس نے وارث کے ہاتھ سے

بریف کیس لے کر ایک طرف رکھ دیا اور خود بڑی وارفتگی کے عالم میں وارث کے سینے سے آنگی — وارث نے بھی اسے باہنوں میں لے لیا تھا۔

”مال ٹھکانے لگا آئے —“

”ہوں —“ وارث نے ہنکاڑا بھرا۔ پھر زہرہ کی پیشانی پر بوسہ دے کر اسے اپنے سینے سے الگ کیا اور بولا۔

”بریف کیس میں پورا سات لاکھ ہے۔ بس ایک رات ہی اس کی حفاظت کرنا ہے۔ پھر جیسا کہ پروگرام بنایا ہے۔ اس رقم کو تم بینک کے لاگرمیں رکھ آؤ گی — میں حفاظت کے لئے تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گا —“

”لیکن یہ سب کچھ تو صبح ہو گا — اس وقت تو پیار کرنے دو۔ باہر کتنی سردی ہے —“ زہرہ بولی اور وارث مسکرا دیا۔ اس نے اوور کوٹ

اتار کر صوفے پر ڈال دیا — زہرہ دروازے کو بند کر آئی تھی اور وارث نے ریوالور تکیے کے نیچے رکھ دیا — پھر دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے تھے — زہرہ زندگی کی مختلف جہتوں کو برتنے کی آرزو مند تھی۔ دکھوں

کا تو سزا کچھ عجبی تھی — اب وہ محبت کا سزا لینا چاہتی تھی۔ اس کی سماعت کسی ایسے نغمہ شیریں کو سننے کے لئے بے تاب تھی جو اس کے وجود کے خلا کو پر کر دے جو اسے تکمیل فات کے احساس سے ہمکنار کر دے — ہاں



وہ اپنے ادھر سے اور نامکمل وجود اور جذبات کو مکمل کرنا چاہتی تھی۔  
 یہی وجہ تھی کہ وہ وارث پر چھا گئی تھی۔ گہری گھٹا بن کر برس پڑنا چاہتی  
 تھی، تاکہ ہلکی پھلکی ہو کر گہری نیند سو سکے۔ — وہ اس قسم کی نیند کو مدتوں  
 سے ترس رہی تھی۔ — لیکن وارث اس حد تک آگے بڑھنا نہیں چاہتا  
 تھا۔ — گو وہ اتنا اچھا انسان نہیں تھا۔ — لیکن اس بوی کو دھوکہ نہیں  
 دینا چاہتا تھا جس نے صرف اس کے نام پر زندگی گزار ہی تھی جس نے  
 اپنی عزت کی اس کے نام پر حفاظت کی تھی۔ — اور وارث خود بھی خیانت  
 نہیں کرنا چاہتا تھا۔ — اب — زہرہ جیسی پیاری عورت کو کیسے سمجھاتا کہ  
 وہ کس قدر مجبور ہے البتہ اس نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے سے الگ  
 کیا۔ — اور بولا۔

”چائے مل جائے گی اس وقت۔ —“

اور زہرہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور ایک گہری سانس  
 لے کر بولی۔

”اس وقت چائے کی ضرورت تو نہیں ہوتا چاہیے تھی تمہیں۔ —“  
 ”کبھی کبھار بے وقت بھی ضرورت محسوس کرنے لگتا ہوں۔ — دراصل  
 زہرہ میں ایک الجھن کا شکار ہوں۔ — بس جیسے ہی اسے حل کر لیا۔ میں  
 تنہا رہی ہر خواہش پوری کر دوں گا۔ —“

”اب کوئی نئی الجھن پیدا ہو گئی ہے۔۔۔“ زہرہ پریشان ہو کر بولی۔

”نہیں۔۔۔ یہ الجھن بہت پرانی ہے۔۔۔ پندرہ سولہ سال پرانی۔“  
 ”کیسی الجھن ہے مجھے بتاؤ۔۔۔“

”ابھی نہیں۔۔۔ اور پھر وہ الجھن میری ذات سے وابستہ ہے۔  
 تم شاید اسے سمجھ نہ سکو۔۔۔ اس لئے تمہیں بتانے کا کوئی ناڈہ بھی نہیں۔“  
 ”تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔۔۔“ زہرہ اپنے جذبات کے ہاتھوں رو ہانسی ہو گئی۔

”تمہیں ہی تو اپنا سمجھتا ہوں۔۔۔ تمہارے سوا اور ہے ہی کون میرا  
 اس بھری دنیا میں۔۔۔ اور اگر اپنا نہ سمجھتا تو اتنی بڑی رقم تمہیں نہ سونپ  
 دیتا۔۔۔ اپنا راز وہاں نہ بنا لیتا۔۔۔ بس جو کچھ کر رہا ہوں تمہاری بہتری  
 کے لئے کر رہا ہوں۔۔۔ ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے گزر گئی ہے۔“  
 ”پپ۔۔۔ پیسہ تو میرے پاس بھی بہت ہے۔ مجھے تو تمہاری ضرورت  
 ہے۔۔۔ تمہیں بتایا تو ہے کہ زندگی کس طرح سلگتے اور جلتے ہوئے ہی  
 گزاری ہے۔۔۔“

”سب جانتا ہوں۔۔۔ لیکن حالات قاتل بن رہے ہیں۔۔۔ وقت  
 ساتھ نہیں دے رہا۔۔۔ اور وقت نے پندرہ سال پہلے بھی ساتھ نہیں

ویا تھا۔ اور آج بھی وہیں ہوں جہاں سے چلا تھا۔ دولت سے سکون میں بھی نہیں خرید سکا زہرہ۔ اس لئے میں بھی ویسا ہی ہوں جیسی تم ہو۔ میں بھی اپنے جذبات کی آہ سے جلتا رہا ہوں جہن مجھے بھی کسی کروٹ نہیں۔“

”کچھ کھو بیٹھے ہو۔“ زہرہ پریشان ہو کر بولی۔

”ہاں بہت کچھ۔ یوں سمجھو کہ اپنی کل کائنات اپنی متاعِ حیات۔

پندرہ سال سے بھٹک رہا ہوں۔ لیکن منزل تک نہیں پہنچ سکا۔“

”منزل معلوم ہے۔“ زہرہ کا لہجہ اس بار بڑا عجیب سا تھا۔

وارث نے اس کی طرف چونک کر دیکھا اور سگریٹ سلگا کر اس نے

گہرا کش لیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”ہاں منزل کا علم ہے۔ یوں سمجھو کہ باکل سامنے ہے لیکن چھو بھی

نہیں سکتا اُسے۔“

”کون ہے وہ۔“ زہرہ کا لہجہ سرسرا تا ہوا سا تھا۔

”کون ہے۔“ وارث بڑبڑایا۔ وہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن سب

کچھ ہے۔“

”کوئی سورت ہے۔“

”بھوڑوان باتوں کو۔ زخم زخم ہوں جہاں بھی ہاتھ رکھو گی ریسنے

لوگوں کا —

”مم — میرے بارے کیا سوچا تم نے —“

”تت — تم تو زندگی کی حرارت بن رہی ہو — شاید باقی زندگی تمہارے جذبات کی آپنج میں گزارنی پڑے۔“

”خدا کمرے ایسا ہی ہو —“ زہرہ اس کے قریب ہو گئی اور وارث کے بالوں سے کھیلنے ہوئے بولی۔

”لباس بدل لو —“

”نہیں مجھے ابھی باہر جانا ہے۔ یہ رات بڑی فیصلہ کن ہے میں نے ان لوگوں سے حساب چکانا ہے — جن کی وجہ سے جیل گیا تھا اور جو میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں —“

”خدا تمہیں کامیاب کرے — میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں —“

”تت — تم بہت دیر بعد ملے پہلے مل جاؤ تو شاید اتنی مدت یوں نہ بھٹکتا —“

”میں پہلے بھی تھا — یہاں تھی —“ زہرہ وارث کے کندھے سے لگ گئی — اور وارث نے اسے تھپتھا کر الگ کر دیا اور بولا۔

”بس اب میں جاؤں گا —“ وارث نے لوت آیا تو سمجھ لیتا کہ کامیاب لوتا ہوں — نہ آیا تو صبح کا انتظار کرتا — پھر میرا بریف کیس کھول لیتا۔

اس میں کچھ کاغذات ہیں شاید تمہارے کام آسکیں —

”ایسی باتیں مت کرو وارث — تمہارے علاوہ میرے پاس بھی کچھ نہیں —“

وارث اٹھ کھڑا ہوا اور ایک بھروپہ نگاہ زہرہ پر ڈال کر تکیے کی طرف بڑھا — ریوالور نکالا اور اوپر کوٹ اٹھا کر باہر نکل گیا۔  
 کچھ دیر بعد وہ ایک چانی پہچانی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔  
 ٹھیک سردرات کے بارہ بجے اس نے ٹیکسی ایک بلڈنگ کے سامنے رکوادی۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک ٹیکسی دور نہیں نکل گئی — پھر وہ حرکت میں آیا — بنگلے کی پشت پر آکر اس نے اندر جانے کے لئے جائزہ لیا — پھر دوسرے ہی لمحے وہ ایک درخت پر چڑھ رہا تھا — یہ شیخ اماں الشد کا بنگلہ تھا۔ درخت کی ایک مضبوط شاخ نے اسے دیوار تک پہنچا دیا تھا۔ پھر اندر اترنا اس کے لئے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا — وہ ایک بار یہاں آچکا تھا۔ یہ سو سال پہلے کی بات تھی — اس کا بنگلہ جانا پہچانا تھا اور راستے بھی اجنبی نہیں تھے — لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کبھی اس گھر میں یوں بھی چوروں کی مانند داخل ہوتا پڑے گا۔ وہ محتاط انداز میں شیخ کے کمرے کے سامنے جا رہا تھا — عیاش انسان تھا۔

غیر شادی شدہ تھا۔ شادی اس لئے نہیں کی تھی کہ اس کی فطرت میں  
ایک عورت پر قناعت کرتا نہیں چاہتا تھا۔ اور وارث جانتا تھا  
کہ اس وقت بھی وہ تنہا نہیں ہوگا۔ کوئی نہ کوئی عورت ضرور اس کی  
خوابگاہ میں موجود ہوگی۔ خوش قسمتی سے دروازہ لاک نہیں تھا جس  
سے ظاہر تھا کہ شیخ جاگ رہا ہے۔ بس وہ اچانک اندر داخل  
ہوا تھا۔ ایک تیز جھٹکا ہوا۔ اور دو جسم جو بہتر پر ایک نظر آ رہے  
تھے ٹپ کر الگ ہو گئے۔ زیر و کے بلب کی نیلی محدود روشنی میں  
عورت کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ البتہ شیخ اسے گھورے جا رہا تھا۔  
”بے وقت آنے کا مجھے افسوس ہے شیخ۔ ہونہ۔ حرکت مت  
کرنا۔ بس یہ نہیں لیٹے رہو۔“ وارث روایہ کو حرکت دے کر بولا۔  
”صبح تمہیں لباس تمہارے ساتھی پہنا دیں گے۔“  
”کیا چاہتے ہو؟“

”تمہاری موت۔ کیونکہ ایک شہر میں دو ایک جیسے انسان نہیں سما  
سکتے۔ میں نے بڑا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ میں نے کام  
کرنا ہے اور مجھے رکاوٹیں قطعی پسند نہیں۔“  
”اس دن کے بعد میرے آدمیوں نے تمہیں نہیں چھیڑا وارث۔ کیونکہ  
میں نے انہیں منع کر دیا تھا۔ اس لئے اب اس کی ضرورت نہیں۔“

”شیخ اس کے ریلوے گھوڑے پر تے ہوئے بولا۔

”سانپ کا سر کچلے بغیر چین نہیں آئے گا مجھے — بتایا ہے ناکہ آزاد ہو کر کام کرنے کا عادی ہوں — اس لئے تمہارا وجود قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”میرا خیال تھا کہ تم با اصول انسان ہو — اس لئے میں نے تمہارے ساتھ کھایا پیا تھا اور پھر اس گیم میں ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی آدمی سے پولیس کی نظروں میں آجائے تو باقی کو سامنے سے ہٹا دیا جاتا ہے یہ نہیں دیکھ ہے کہ تمہاری پیروی کیوں نہیں کی گئی اور — پیروی فضول تھی کیونکہ تمہاری ہر حالت میں سزا ہوتا تھی — اس لئے بحالت مجبوری... خاموش رہنا پڑا — ورنہ اتنا مال کھو کر انسان چین سے نہیں بیٹھ سکتا اس لئے بہتر ہے کہ سمجھوتا کرو — قتل و غارت کر چھوڑو — اگر تم الگ کام کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی انکار نہیں — البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہم دونوں امن سے رہیں — حالانکہ تم نے چارہ آدمی بیکار کر دیئے لیکن پھر بھی میں نے کوئی ایکشن نہیں لیا — صرف اس لئے کہ تم جیسے انسان کو کھونا نہیں چاہتا تھا — جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے دوبارہ چھیڑا تک نہیں — اس لئے تم اس یقین کے ساتھ ریلوے کو جیب میں ڈال لو کہ ہم دونوں دوست ہیں اور دوستانہ فضا میں بات



کرتے ہیں۔ دیکھو میری ساستھی پریشان ہو رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے مجھے لباس پہن لینا چاہیے۔“

”باتیں تو تمہاری دل کو لگ رہی ہیں شیخ لیکن اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

”اس اعتماد کا شکریہ وارث۔“ شیخ پہلی بار مسکرایا لیکن وارث محتاط تھا۔ شیخ وہیں بیٹھے بیٹھے قالین پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھانے لگا تھا۔ عورت نے بھی ایک گہری سانس لی تھی اور اس نے کمبل کو سینے تک اوڑھ لیا تھا۔ شیخ نے اپنی تپلون پہن کر بستر چھوڑ دیا۔ پھر وہ کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

”تم بھی بیٹھ جاؤ وارث۔“

”میں یہاں مطمئن ہوں شیخ۔ اب کام کی بات کر لو۔ میں ایک بار تم پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ کیونکہ کچھ وقت ہم نے ایک ساتھ اچھا گزارا ہے۔“

”تمہارے پاس جو مال تھا تقریباً سات ساڑھے سات لاکھ کا تھا۔“  
 ”سات لاکھ کا۔“ وارث ہونٹ سیکڑ کر بولا۔

”چلو یوہنی سہی۔ لیکن آدھا آدھا کر لیتے ہیں۔ اکیلے کھانے سے تمہیں مفہم نہیں ہوگا۔ بانٹ کر کھائیں گے تو پھر بھی مل بیٹھے کا وقت

آسکتا ہے۔ اس طرح دوستی مضبوط ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے تم آرام کرو میں ایک دو ہفتے تک سوچوں گا۔ اگر تمہاری بات سمجھ میں آگئی تو تمہارا حصہ تمہیں پہنچ جائے گا۔“

”اور مجھے تمہاری واپسی کا انتظار رہے گا۔“ شیخ مسکرا کر بولا۔

اور وارث چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم پلٹا

اور باہر نکل گیا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح شیخ کو نرم کرے اور

اسے مرعوب بھی کرے۔ جب وہ اپنے آمد والے راستے سے واپس

جانے لگا تو پشت سے آواز آئی۔

”وارث اب گیٹ کی طرف سے جاؤ۔ دوست بن کر جانے ہے

ہو، دشمن نہیں چوکیدار گیٹ کھول دے گا۔“ یہ آواز شیخ کی تھی

وارث کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ ابھر کر مٹ گئی۔ وہ راستہ بدل

کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار کو شاید شیخ نے فون پر اطلاع کر

دی تھی کہ اسے راستہ دے دیا جائے۔ کیونکہ چوکیدار رافیل کے لئے اس کا

منتظر تھا۔ وارث اسے بھی محتاط انداز میں دیکھتے ہوئے باہر نکلا تھا۔

پھر دس منٹ بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھا واپس جا رہا تھا۔ وہ سرد جنگ

جیت چکا تھا۔ خوش تھا کہ برے انسانوں سے جان چھوٹ گئی اور یہ

سب کچھ اس نے اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر کیا تھا۔

جب وہ فلیٹ میں داخل ہو رہا تھا تو ایک بچہ کمر دس منٹ ہو  
 رہے تھے۔ زہرہ اس کی منتظر تھی۔ اسے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑی ہو  
 گئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس سے یوں لپٹی جیسے اس کے جسم کا  
 کوئی حصہ رہی ہو۔ وہ خوشی سے رو پڑی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔  
 ”میں خدا سے تمہاری زندگی کی گڑ گڑا کر دعائیں مانگتی رہی ہوں اور  
 مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تم صبح تک نہ لوٹے تو شاید میرا بھی دم نکل  
 جائے گا۔“

”آج رات تمہاری ہے زہرہ۔“ اتنا کہہ کر وارث نے اسے  
 باہنوں میں بھر کر بستر پہٹا دیا۔ اور زہرہ ایک دم مٹ گئی تھی جیسے  
 اس کا پورا وجود چور بن گیا ہو۔

---

زہرہ کے لئے بیس بڑی خوشگوار تھی۔ ہاتھ سے اس کے گنگنانے کی  
 آواز آرہی تھی۔ اور وارث جو ابھی تک بستر پہ دراز تھا، گہری سوچوں  
 میں اترا ہوا تھا۔ بنجانے کیوں اس کا ذہن الجھ رہا تھا اور زہرہ جو ہاتھ  
 میں غسلی لیتے ہوئے گنگنا رہی تھی، وارث کو زہرہ لگ رہی تھی۔ گواہوں  
 نے رات کی صبح بڑی خوشگوار کی تھی اور زہرہ جو ایک مدت سے  
 پیاسی تھی، جی بھر کر سیراب ہوئی تھی۔ لیکن وارث بنجانے کیوں محسوس  
 کر رہا تھا جیسے اس عورت کو اپنا کہ اس نے زندگی کی بدترین غلطی کی  
 ہے۔ اور دیکھا جائے تو وارث اگر اس انداز سے سوچتا کہ وہ بھی زندگی  
 میں سائرہ کے بعد اگر مطمئن ہوا تھا۔ اور فرحت بخش لمحوں سے ہمکنار  
 ہوا تھا تو اس لحاظ سے زہرہ بڑی نہیں تھی۔ اس کی زندگی تو اس  
 بنجر زمین کی مانند تھی جس سے کبھی ہریالی پیدا نہ ہوتی ہو۔ لیکن وہ

اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ جو اس کی اصل منزل تھی کیا وہ زہرہ کی وجہ سے کھودے گا۔ گو کہ وہ پہلے ہی اس سے بہت دور تھی۔ لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد تو کر سکتا تھا۔ لیکن زہرہ سنگ گراں بن گئی تھی۔ وہ ایک ادھوری عورت تھی۔ اس کی طرح۔ جیسے وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ادھورہ تھا۔

جب زہرہ غسل سے کہ باہر نکلی تو بہت زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی صرف اس سے زیادہ نکھار اس پر آیا تھا۔ وہ مسرور تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی انمول شے کو پا کر انسان کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔

”اٹھو نا، کب تک یوں لیٹے رہو گے۔ پانی گرم ہے غسل کر لو۔“

وہ اٹھلا کہ بولی۔ جیسے وارث اس کی جائیداد رہا ہو۔

وارث اٹھ گیا۔ اور سیدھا غسل خانے میں جا گھسا۔

جب وہ باہر نکلا تو زہرہ نے اسے دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑا دیا اور مسکرا کر بولی۔

”چلو یہ پورا گلاس پی جاؤ۔ صحت بنے گی۔“

”صحت میری پہلے بھی کچھ مناسب ہی ہے۔ ویسے زہرہ، رات جو کچھ ہوا، مناسب نہیں ہوا۔ میں شرمسار ہوں۔“

”ارے یہ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔“ زہرہ اٹھا کر بولی۔ ”زندگی کے یہ چند لمحے ہی تو تھے جو اپنے تھے اور۔۔۔ پھر ہم دونوں نے ذہنی طور پر ایک دوسرے کو قبول کیا ہے۔۔۔ اب صرف یہ سوچنا ہے کہ شادی کب کرنا ہے۔۔۔“

”شادی۔۔۔“ وارث تھوک نکل کر بولا۔۔۔ دودھ کا گھونٹ پینے میں اٹک گیا تھا۔

”ہاں شادی جو اب بہت ضروری ہے اور ضروری اس لئے ہے کہ بھائی جان کو اس بات کا علم ہو چکا ہو گا کہ میں نے رات تمہارے پاس گزاری ہے۔۔۔“

وارث ایک تیز جھٹکے سے پٹا تھا اور اس نے خالی گلاس ایک طرف رکھ دیا۔۔۔ دوسرے ہی لمحے وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گیا تھا۔  
”میں نکال دیتی ہوں۔۔۔ تم بیٹ جاؤ ادھر سے۔ اب یہ کام تمہارے نہیں ہیں۔۔۔“

وارث نے بے بسی سے ہونٹ چبا ڈالا۔۔۔ اور خاموشی سے ایک طرف بیٹ گیا۔ زہرہ نے کپڑے نکالے تھے۔۔۔ اور اسے مختلف جوتے دکھاتے ہوئے بولی۔

”دیکھو یہ ٹھیک رہے گا یا۔۔۔ یہ آسمانی کٹر کا سوٹ۔۔۔“

”جو مناسب سمجھو نکال لو۔“ وارث کا لہجہ سرد پن لئے تھے۔

زہرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی۔

”کیوں پریشان ہو۔۔۔ پریشانیوں تو رات کو ہی ختم ہو گئی تھیں۔“

وارث کچھ نہ بولا۔۔۔ سگریٹ سلگا کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

اس کی نگاہیں زہرہ پر مرکوز تھیں جو سوٹ سے میچ کرتی ہوئی شرٹ

نکلاش کر رہی تھی۔۔۔ وارث دیکھ رہا تھا کہ زہرہ جمال ایک بھر پور

عورت ہے۔۔۔ ہر زاویے سے خوب صورت اور دلکش انداز لئے

ہوئے۔۔۔ ایسی عورتیں مقدر والوں کو ملتی ہیں۔۔۔ پھر میں کیوں اسے

دھتکار رہا ہوں۔۔۔ آخر میرا دنیا میں ہے کون۔۔۔؟ سائرہ مجھے پندرہ

سال سے قبول نہیں کر رہی ہے۔۔۔ بچوں کی تربیت ہی اس نے کچھ اس

انداز سے کی ہے کہ وہ باپ کا شاید نام بھی سنا گوارا نہ کریں۔۔۔ پھر

اس کی زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔۔۔؟ یہ زہرہ۔۔۔ جو اس کی

زندگی میں ہوا کے مشکبار سمجھنے کی مانند داخل ہوئی ہے اور اس کے

حواس پر چھا گئی ہے۔۔۔ پھر اس کا جرم بھی تو کوئی نہیں۔۔۔؟ پیاسی

ندیا ہی تو ہے۔۔۔ جو خشک سالی کا شکار ہو گئی۔۔۔ بچے نہیں پیدا کر

سکتی تو کیا ہوا۔۔۔ مجھے بچوں کی ضرورت ہی کب ہے۔

”ناشتہ کس وقت ہوگا۔۔۔؟“ وہ اچانک اس کی طرف پلٹ کر بولی۔



”کس وقت ہونا چاہیئے —“

”نوبت — کیوں ٹھیک ہے نا —“

”جیسے مناسب سمجھو —“ وارث نے ہتھیار ڈال دیئے۔

پھر سارا دن وارث آوارہ گردی کرتا رہا تھا — رات کو اس کی ملاقات توقیر خان سے ہوئی تھی — اور بچانے کیوں وارث اسے دیکھ کر شرمندہ ہو گیا تھا۔

”بھئی مسٹر وارث! اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دینا —“  
 ”فی الحال تو مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں جناب — آپ کی ہیرانیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں —“

”زہرہ بتا رہی تھی کہ تم اس سے نکاح کرنا چاہتے ہو — اور دیکھا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم دونوں سمجھ دار ہو — ویسے اگر تمہارے چند ایک رشتے دار اس شہر میں ہوں تو انہیں بلوالو تاکہ اس نیک رسم میں شریک ہو جائیں اور اگر نہیں ہیں تو تب بھی کوئی پردا مت کرو —“

وہ ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا اور وارث پریشان ہو کر اس کی صورت تکتا رہا۔

”کیوں مسٹر وارث! کیا پردہ گرام ہے اب — اگر یہاں کوئی واقف کار

نہیں تو پھر میں خود ہی انتظام کر لیتا ہوں —“

”م — مجھے کچھ وقت دیجئے۔ میں آپ کو حالات سے آگاہ کر دوں گا۔“

”حالات کیسے —؟ شادی کرنا ہے کوئی برا عظم تو تلاش نہیں کرتا۔“

مجھے بتاؤ کیا پرالہم ہے —؟“

”پھر بات کروں گا آپ سے جناب — اس وقت مجھے کچھ اپنی

پریشانی ہے —“

”میاں پریشان ہونا چھوڑو، جینا سیکھو — یہ دنیا ہے —“

”جی ہاں درست فرمایا آپ نے —“ وارث تھوک نکل کر بولا۔

اور پھر توقیر خان اس کے کندھے پر تھپکی دے کر چلا گیا اور وارث

سرکچہ کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد زہرہ چلی آئی۔

”یہ حضور سراپتے میں کیوں گئے ہوئے ہیں —؟“

”جناب کے بھائی جان یوں شادی کا کہہ رہے تھے جیسے میں سہرا

باندھے تیار بیٹھا ہوں —“

”نہیں تیار بیٹھے تو تیاری کر لو — کون سے بنیڈ باجے بجانا ہیں۔“

وہ ہنس کر بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے — اس موضوع پر پھر بات کریں گے میں بہت

تھک گیا ہوں — سونا چاہتا ہوں اور —

”اور میں چلی جاؤں کیوں ٹھیک ہے نا —“

”مناسب تو یہی ہے —“

”میں رات تمہارے پاس رہوں گی —“

”لیکن اب شادی سے پہلے میں یہ مناسب نہیں سمجھتا —“

”میں رات یہاں رہنے کے لئے کہہ رہی ہوں، سونے کے لئے نہیں۔“

وہ ہنس کر بولی۔

اور وارث اسے گھور کر بولا۔

”شادی بیاہ کیا گڑیا گڑھے کا کھیل ہے —“

”نہیں میرا اور تمہارا خیال ہے —“ زہرہ ایک ادائے ناز سے

اٹھلائی اور وارث آنکھیں بند کر کے صوفے سے ٹک گیا۔

وہ رات پھر بڑے جو بن کی تھی — دونوں نے رات کی صبح اپنی

حسرتوں کو دل کی دھڑکنیں سنانے میں کی — اور پھر یونہی دن بیتتے

پہلے گئے — وارث زہرہ کی زلفوں کا اسیر سوچ چکا تھا۔ نکاح کے لئے

اس نے ایک وقت مقرر کر دیا تھا — دونوں دن رات خرید و فروخت

کر رہے تھے — ہر روز گھر میں کچھ نہ کچھ آ رہا تھا۔ وارث نے خوبصورت

قسم کا زیور تیار کر دیا تھا — جو اس نے زہرہ کو دینا تھا — دیکھا جائے

تو زہرہ کے پیار کی شدت نے اسے کہیں سے کہیں جا پہنچایا تھا۔ وہ سب  
رشتے نامٹے بھول گیا تھا۔ پھر اس سے قبل کہ دونوں نکاح کے بندھن  
میں جکڑے جاتے، ایک عجیب و غریب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

زہرہ بھائی کے فلیٹ میں تھی۔ وارث کچھ دیر پہلے ہی لوٹا تھا۔  
وہ زہرہ کو بتا کر جانا چاہتا تھا۔ لیکن زہرہ بھائی کے ہاں تھی

لیکن وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اچانک دروازہ کھلا۔  
اور سائرہ اندر داخل ہوئی۔ اور وارث اسے دیکھ کر یوں صوفے  
سے اچھلا جیسے اسے بچھونے ڈنگ مار دیا ہو۔ وہ اس کے سامنے  
کھڑی تھی پریشان حال۔ زرد چہرہ لئے۔ ایسا زرد چہرہ جیسے کسی  
بیت ہی قریبی عزیز کو دفنا کر آئی ہو۔

”وارث۔۔۔ اس نے ہونٹ رنڈے تھے۔

”کہو۔ کہو کیا بات ہے۔۔۔“ وارث اس کی آواز سن کر  
جیسے سوتے سے بیدار ہوا ہو۔

”بب۔ بیٹے کو بچالو۔ وارث اپنے بیٹے کو بچالو۔“

اتنا کہہ کر وہ رو پڑی اور وارث تڑپ کر آنکھیں بڑھا۔ اور سائرہ  
کو شانوں سے بکڑ کر بولا۔

”کیا ہوا میرے بیٹے کو۔۔۔“

اور سائرہ جواب دینے کی بجائے اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔  
 آہ — پندرہ سال بعد اس کی محبوب بیوی اس کی باہنوں میں پہلی  
 بار سمائی تھی۔

”سائرہ — بولو کیا ہوا اسے —“

”وہ — وہ تمہارے راتے پر چل نکلا ہے —“ سائرہ ہنس  
 پڑی تھی — اس کے لہجے میں چھپا ہوا درد جیسے پورے وجود سے اُبل  
 رہا ہو — وہ وارث کی باہنوں میں پوری جان سے لرز رہی تھی اور  
 وارث جیسے اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہو — صرف ایک جملے نے کہ  
 وہ تمہارے راتے پر چل نکلا ہے — اس کے لئے کس قدر غلیظ گالی  
 تھی جیسے وہ گالی تھری ناٹ تھری رائفل سے نکل کر سیدھی اس  
 کے سینے میں گھسٹی ہوئی دل میں پیوست ہو گئی ہو۔

یہ سائرہ ہی تو تھی جو پندرہ سال تک اس سے دور رہی — جس  
 نے زندگی کا خوب صورت اور جوان حصہ — صرف اولاد کو اس سے  
 اس لئے دور رکھا کہ کہیں وہ باپ کا اثر قبول نہ کر لے — اس نے  
 اولاد کے لئے پوری زندگی تیاگ دی — اپنے جذبات اور احساسات  
 کو کچل کر گہری بنڈ سلا دیا — اپنی جوانی کا ہر تقاضا مٹا دیا — لیکن جب  
 اس نے دیکھا کہ جس برائی سے بیٹے کو بچانا چاہتی تھی وہی اس نے اپنا لی

ہے تو بے سہارا ہو کر شوہر تک چلی آئی۔ وارث نے اسے بڑے پیار سے  
 صوفے پر بٹھا دیا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ  
 اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

”گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حوصلے سے بات کرو۔  
 مجھے بتاؤ کہ وہ کس راستے پر چل نکلا ہے اور تو جو ایک چٹان تھی، ایک دم  
 سے کیوں گر گئی؟“

سائہ نے جو شوہر کا یہ انداز اپنائیت دیکھا تو آنسوؤں سے لبریز چہرے  
 کے درمیان بولی۔

”وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو تم کرتے تھے۔ اسے بھی اپنی غربت  
 دور کرنے کا خیال آ گیا ہے۔ جیکہ میں نے اسے تم سے دور رکھا  
 تمہارے سائے سے بھی بہت دور۔ لیکن یہ بھول گئی کہ اس کی  
 رگوں میں خون تو تمہارا ہی دوڑ رہا ہے۔“

”نہیں سائہ ایسا مت کہو۔ میں بس انسان نہیں تھا، اور نہ ہوں  
 ہاں تم سے دور رہ کر کچھ برائیاں ضرور اپنائیں۔ اگر تم مجھے اپنی قربت  
 میں رہنے کا موقع دیتیں تو میں اتنی دور نہ نکل جاتا۔ اور آج جب تم  
 نے اپنے بیٹے کو میرا بیٹا کہہ کر پکارا ہے تو احساس ہوا کہ جب وہ برائی  
 کے راستے پر نہیں چلا تھا تو تمہارا تھا۔ اور آج وہ کوئی برائی اپنا چکا

ہے تو میرا ہو گیا — چلو یو نہی سہی — تم نے میرا بیٹا تو کہا —  
 ”کچھ کرو وارث — کچھ کرو — میرا بیٹا — میرا نہیں رہا —“  
 ”گھبراؤ نہیں — سب ٹھیک ہو جائے گا —“ وارث نے سائرہ

کے دونوں ہاتھ چوم لئے — اور وہ پھر رو پڑی — اور بولی  
 ”اٹھو — میرے پاؤں میں کیوں بیٹھ گئے ہو — تمہاری جگہ تو  
 میں نے ہمیشہ دل میں رکھی ہے — صرف تمہیں اولاد سے دور کیا تھا۔  
 اپنے آپ سے نہیں —“

اور وارث نے جیسے ہی پھر سائرہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا، سائرہ نے  
 اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولی۔

”کچھ کرو وارث — میرا بیٹا مجھے لوٹا دو —“  
 ”چلو مجھے گھر لے چلو — اور اپنی اولاد کو بتاؤ کہ میں کون ہوں —“  
 ”نہیں — نہیں — میں یہ نہیں کر سکتی —“  
 ”کیوں نہیں کر سکتیں — ؟ آخر کیوں نہیں —؟“

”تم جو کاروبار کرتے ہو — ان لوگوں سے تمہارا واسطہ ہے، خرم  
 نے بھی جو راستہ اپنایا ہے — تم ان لوگوں کا سراغ لگاؤ اور انہیں  
 منع کرو کہ تمہارے بیٹے کو دھتکار دیں — اسے ایسے روپوں کی ضرورت  
 نہیں — جسے حاصل کر کے دلوں سے دھواں اٹھے اور گھروں سے جنازے



اٹھنا شروع ہو جائیں۔۔۔ تم جو کاروبار کرتے ہو۔۔۔ تم نے کبھی اس کے بارے سوچا کہ اس سے کتنی زندگیاں برباد ہو رہی ہیں۔۔۔ کتنا خون بہہ رہا ہے اور کیسے کیسے گھرا جڑ رہے ہیں۔۔۔“

”مم میں اب کچھ نہیں کرتا۔۔۔ بس سمجھ لو کہ کچھ نہیں کرتا۔۔۔ تم مل گئی ہو تو سب کچھ بھول جاؤ۔۔۔ اور۔۔۔“ وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔۔۔ اسے اپنی پشت پر آہٹ سی سنائی دی تھی۔۔۔ پھر دروازے کے پٹ سے ٹیک لگائے اس نے زہرہ کو کھڑے دیکھا۔ ساڑھ کی نظریں بھی اس پر گڑھی ہوئی تھیں۔

”یہ۔۔۔ یہ میری بیوی ہے ساڑھ۔۔۔“ وارث کی آواز درمیان میں ٹوٹ گئی۔ اور زہرہ وہیں ساکت بت بنی لھڑی رہی۔

”آؤ چلیں۔۔۔“ اچانک وارث نے ساڑھ کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے لے کر زہرہ کے قریب سے گزرتا ہوا۔ باہر نکل گیا۔

نکل تو وہ گیا تھا۔ لیکن زہرہ کے ہونٹوں سے نکلنے والی کراہ اسے صاف سنائی دے گئی تھی۔ یہ دل ٹوٹنے کی آواز تھی۔ وہ ساڑھ کو لئے آہستہ آہستہ پیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ساڑھ سے کہہ رہا تھا کہ۔۔۔

”ساڑھ! تم گھر جاؤ۔۔۔ میرا انتظار کرنا۔۔۔ میں بہت جلد آؤں گا۔“

اور اس یقین کے ساتھ آؤں گا کہ تیرا بیٹا پھر کسی غلط راستے پر نہیں چل سکے گا۔ تیرا گھر جنت بنا دوں گا اور تمہیں بھی تو ایسے ہی گھر کی تمنا تھی۔“

سائرہ نے اس کی طرف نذر تکی نگاہوں سے دیکھا اور وارث نے اس کے قریب سے گزرتی ہوئی ٹیکسی ردک کر اس میں بیٹھا دیا۔

”خدا حافظ سائرہ —“ وہ جاتی ہوئی ٹیکسی کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

پھر دوسرے ہی لمحے وہ فلیٹ کی طرف بھاگ رہا تھا — اوپر پہنچا تو زہرہ کو گم صم صوفے پر بیٹھا پایا — وہ ایک دم ٹھٹھک گیا — دونوں کی نگاہیں ملیں — اور وارث نگاہیں چہرا گیا — وہ آگے بڑھا اور ریو الور کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”معاف کرنا زہرہ — میں نے تمہیں کئی بار بتانا چاہا تھا — لیکن تم نے کبھی موقع ہی نہیں دیا — میرا بیٹا اس وقت خطرے میں ہے اس کی زندگی خطرے میں ہے — میری بیوی نے اپنی اولاد کو برائی سے دور رکھنے کے لئے مجھے اپنے سے دور کر دیا تھا — لیکن بُرا ہو وقت کا کہ وہ اپنے آپ کو دوسرا گیا — بس یوں سمجھ لینا کہ ایک دور ہے پر دو اجنبی ملے تھے — اور پھر اپنے اپنے راستوں پر چل دیئے — خدا حافظ زہرہ خدا حافظ — میری زیادتیاں معاف کر دینا —“ اتنا کہہ کر وارث جانے کے لئے پلٹا — اور زہرہ اسی لمحے بولی۔

سبکتی ہوئی تڑپتی ہوئی آواز تھی۔

”سنو۔“

اور وارث رک گیا۔

زہرہ چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک آہ کے ساتھ بولی۔  
 ”جہاد۔ خدا حافظ۔“ اتنا کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور  
 وارث چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر رڑپی آہستگی سے  
 باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ شیخ امان اللہ کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔  
 اسے احساس تھا کہ اس کے بیٹے کو اس راستے پر ڈالنے والا سوائے  
 اس انسان کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے ذہن میں بگولے سے  
 چکر رہے تھے۔ جب وہ شیخ امان اللہ کے بنگلے کے گیٹ پر پہنچا تو اس  
 نے چوکیدار سے کہا کہ اندر اطلاع کر دو کہ وارث ملنے آیا ہے۔

چوکیدار جو وہی تھا اسے گھور کر دیکھا اور پھر قریب رکھے ہوئے  
 فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ اجازت ملنے پر اندر جا  
 رہا تھا۔ اس نے شیخ کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے جیب  
 میں رکھے ہوئے ریوالور کی موجودگی کا احساس اسے چھو کر گیا تھا۔ پھر  
 اس نے دروازے پر پہنچ کر دستک دینا گوارا نہیں کیا۔ ایک دم اندر

داخل ہو گیا۔ لیکن وہاں شیخ تنہا نہیں تھا۔ تین آدمی مزید موجود تھے اور یہ شیخ کے باڈی گارڈ تھے۔ شہر کے چھٹے ہوئے بد معاش — اور شیخ کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری تھی — وہ وارث کو دیکھ کر بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم بہت جلد آؤ گے — اور دیکھو آ گئے۔“  
”ہاں مجھے آنا تھا۔ کیونکہ تم جیسے انسان کی کمینگی کو نظر انداز کر گیا تھا۔ اب صرف اتنا بتا دو کہ میرے بیٹے کو تم کس طرح جانتے تھے۔“

”یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وارث جب تم جیل سے فارغ ہو کر آئے تھے تو تمہارا مسلسل تعاقب کیا جا رہا تھا۔ اور اسی تعاقب کے دوران معلوم ہوا کہ تم وہ اصل کون ہو۔ اور گھر سے کیوں دور رہتے ہو۔ تمہارا بیٹا بے کار تھا۔ لہذا اسے کام پر لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اب تم ہمارا تمام سودا ہمیں واپس لوٹا دو گے یا پھر وہ رقم جو تم حاصل کر چکے ہو۔“

وارث کے ہونٹوں پر زہر خند دوڑ گیا۔ اور بولا۔

”مجھے جب پتہ چلا کہ میرا بیٹا میرے راستے پر چل نکلا ہے تو مجھے تمہارا خیال آیا۔ اور دیکھ لو کہ میں سیدھا تمہارے پاس آ پہنچا ہوں اور

اب میں چاہتا ہوں کہ اس کہانی کو انجام دے دوں — جو مسلسل پندرہ سال سے میرا پیچھا کر رہی ہے — ”اتنا کہتے ہی وارث نے جیب سے ریوالت نکالا اور بڑی تیزی سے تینوں بد معاشوں کو شوٹ کر دیا — بس تین لمحے خرچ ہوئے تھے — وہ تینوں سینوں پر ہاتھ رکھ کر وہیں دوہرے ہو گئے — شیخ اماں الٹ ہو کھلا کر کھڑا ہو گیا تھا — اور وارث اس کی طرف ریوالت کرتے ہوئے بولا —

”میرا نشانہ بہت شاندار ہے شیخ — دراصل تم نے مجھے سمجھنے میں بہت غلطی کی — تمہیں بتایا تھا کہ ایک جیسے دو انسان ایک شہر میں نہیں سما سکتے — تم نے میرے بیٹے کو اس دھندے میں ڈال کر اپنی موت کو آواز دے لی ہے — اور آج میں اس شہر کو ایک زہریلے ناگ سے پاک کر دوں گا —“

منن — نہیں — تم ایسا نہیں کر سکتے — ”شیخ اپنے مردہ ساتھیوں کو دیکھ کر گھبرا کر بولا —

”مجھے کون روک سکتا ہے اب — آج پہلی بار تو میری بیوی نے مجھے آواز دی ہے — اور مجھے احساس ہوا ہے کہ میں ایک زندہ انسان ہوں —“ اتنا کہہ کر وارث نے شیخ کے دل کا نشانہ لے کر گولی چلا دی — ایک بار پھر دھماکہ ہوا — اور شیخ دل پر ہاتھ رکھ کر وہیں

دوہرا ہو گیا۔

”خس کم چہاں پاک۔“ وارث ہڑ بڑا کہ تیزی سے واپس مڑا۔

اور واپسی پر اس نے بڑے آرام سے چوکیدار کو بھی موت کی

گہری نیند سلا دیا۔ — اوریوں ہاتھ جھاڑ کر باہر نکلا۔ — جیسے تمام دکھ

درد ختم کر بیٹھا ہو۔

اس کے سر پانچ خون تھے — لیکن گواہ کوئی نہیں تھا — اس نے  
 نشان تک نہیں چھوڑا تھا — اس نے شہر کو ایک بدترین برائی سے  
 بچا لیا تھا — ایسے انسان کو ختم کیا تھا — جو معاشرے میں زہر پھیلا  
 رہے تھے — چاہتا تو خود آرام سے زندگی بسر کر سکتا تھا — لیکن  
 وہ سپیدھا پولیس اسٹیشن جا پہنچا تھا — اسے پولیس اسٹیشن ہی آنا چاہیئے  
 تھا۔

کیونکہ وہ زہرہ کے دل ٹوٹنے کی آواز سن چکا تھا۔  
 جس نے زندگی کے آخری حصے میں اپنا ایک ساتھی چنا تھا — اور  
 جب منزل قریب آ پہنچی تھی تو وہ غیر نکلا تھا — وارث کو یقین نہیں تھا کہ  
 حالات یوں ایک دم اپنا رخ تبدیل کریں گے — وہ تو صرف یہی جانتا تھا  
 کہ — پندرہ سال جس طرح سائہ کی بے رخی کی تندر ہو گئے تھے۔ باقی



زندگی بھی یونہی بیت جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے زہرہ کو قریب آنے دیا تھا۔ اور پھر وہ خود بھی محبت کو ترسا ہوا انسان تھا۔ پندرہ سال سے محبت کے دو میٹھے بولوں کے لئے ترستا اور تڑپتا رہا تھا۔ پیاس اس حد تک جا پہنچی تھی کہ زہرہ جمال کی زلفوں کا انیسر سو گیا۔ بلکہ یوں کہتا چاہیئے کہ مجبور کر دیا گیا۔ اور جبکہ اسے ساڑھ نے اپنا کہہ کر آواز دی تو وارث یوں بیدار ہوا۔ جیسے مدت سے سوتا رہا ہو۔ اس نے یہی تو کہا تھا کہ اپنے بیٹے کو بچالو۔ کس قدر انتہا تھی اس کے لیے۔ اور کس قدر اپنا جان کر اس تک چلی آئی تھی۔ اور وارث نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

اور اب زہرہ کے پاس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ لہذا اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

جب صبح کے اخبار چنچ اٹھے اور خرم کے ہاتھ سے اخبار چھوٹا تو وہ زرد ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ جن آدمیوں کو وارث نامی انسان نے قتل کیا تھا۔ وہ سب اس کے جانے پہچانے چہرے تھے۔ یہ وہی لوگ تو تھے جنہوں نے اسے بے کاری میں روزگار مہیا کیا تھا۔ اور وہ سب قتل کر دیئے گئے تھے۔ خرم پریشان تھا۔ وہ اس وقت گھر سے کچھ فاصلے پر کیفے ایرانی کے ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں وہ

اکثر چائے پیا کرتا تھا۔

اس نے مزید خبر کو پڑھا — وارث نامی انسان جس نے پانچ آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد پولیس کو یہ بیان دیا تھا۔

”میں خود ایک پاپی انسان ہوں۔ پندرہ سال قبل بے روزگاری سے تنگ آکر میں نے اس لعنتی اور کالے دھندے کو شروع کیا تھا — تاکہ میرے بچے بھوک سے ہلک ہلک نہ مر جائیں — لیکن میری بیوی نے مجھے اور میری اس کمائی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور مجھے گھر چھوڑ دینا پڑا — بلکہ بیوی نے اپنے بچوں کو میرے سائے سے بچانے کے لئے مجھے ان سے دور کر دیا — اور آج جب میں نے دیکھا کہ منزل سے بہت دور جا چکا ہوں — اور میری اولاد مجھ جیسے انسان سے ملنے کو تیار نہیں — تو میں نے اس برائی کو ہی ختم کر دیا — جس نے سینکڑوں ہزاروں گھر برباد ہو رہے تھے میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر مجھ جیسا کوئی انسان حالات سے تنگ آکر اس راستے پر چل نکلے — جو مجھے بیوی اور بچوں سے دورے کیا تھا — کیونکہ ایسی کمائی کرنے والے نوجوان کبھی بیوی کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں اور کبھی ماں اور بہن

کو دھوکہ دے کر اپنے حالات سنوار رہے ہوتے ہیں۔ میں نے اس شہر سے ان لوگوں کو ختم کر دیا ہے۔ جو اس کا روبرو کے بانی تھے۔ جنہوں نے مجھ جیسے انسانوں کی زندگیوں پر باد کر ڈالی تھیں۔ اب مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔ کم از کم مرتے وقت یہ تو سکون ہو گا کہ ایک نیک کام کر چلا ہوں شاید خدا مجھے معاف کر دے۔ اور میری بیوی اور بچے بھی مجھے معاف کر دیں۔“

یہ تھا وہ بیان جو وارث کی طرف سے۔ ایک خونی کی جانب سے شائع ہوا تھا۔ جسے پڑھ کر خرم پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو سیدھا بال کے قدموں پر آگرا تھا۔ اور رو کر کہہ رہا تھا۔ ”مجھے معاف کر دو مال۔ مجھے معاف کر دو۔ میں بڑے راستے پر چل نکلا تھا۔“

تب سائرہ نے اسے یلنے سے لگا کر پوچھا تھا۔ ”کیا ہوا بیٹے۔ کیا ہوا؟ کیوں پشیمان ہو رہے ہو۔؟“ بتاؤ کس راستے پر چل دیئے تھے تم۔؟“

تب خرم نے سائرہ کو بتایا کہ وہ بے روزگاری سے تنگ آ کر جس راستے پر چل نکلا تھا۔ لیکن ایک انسان نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

پھر جب پوری خبر خرم نے سائرہ کو سنائی تو وہ چکرا کر ایک دم بیٹھ گئی۔

”کیا سوال —؟“

”وہ تیرا باپ ہے بیٹے — وہ عظیم انسان تیرا باپ ہے — اور یہ سب کچھ اس نے تمہیں بچانے کے لئے کیا ہے — مجھے بتاؤ وہ اس وقت کہاں ہے —؟ اسے اپنی ادلا د کی اور بیوی کی ضرورت ہے چلو جلدی کرو بیٹے — میں اس سے ملنا چاہتی ہوں —“

خرم نے ماں کو سنبھالا — اور پھر سائرہ نے پندرہ سال کی داستان بیٹے کو سنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کے گھر آنے والا مہمان کون تھا۔ کمرے میں ایک سناٹا مسلط تھا — اور اس سناٹے میں دو دل تیزی سے دھڑک رہے تھے — ایک دل باپ کے گلے لگنے کے لئے تڑپ رہا تھا — اور دوسرا دل شوہر کے پاؤں میں بیٹھے کو ترس رہا تھا۔ پھر دل بیتے چلے گئے — اور دور جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا ہوا انسان — سوچ رہا تھا کہ اس نے اس گھناؤنے ماسے پر چل کر کیا کھویا اور کیا پایا — جب اسے بتایا گیا کہ اس کی ملاقات آئی ہے تو وہ بے تابی سے اٹھا تھا اور بھاگتے ہوئے وہاں تک پہنچا تھا۔ اس کے سامنے اس کا بیٹا خرم، بیٹھا انا — اور اس کی بیوی سائرہ کھڑی تھی۔

سائہ نے آگے بڑھ کر وارث کے پاؤں کو چھوا تھا — اور بیٹا، باپ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر — آنکھوں سے لگا کر رو پڑا تھا — اور قریب کھڑی انا کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا چائے کا حقیر اس شدت جذبات سے لرز رہا تھا۔

”قریب آؤ بیٹی — دور کیوں کھڑی ہو — وارث ٹرپ کر بولا۔  
 ”مم — میں آپ کے لئے چائے لائی ہوں ابو — چائے جو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے — نہ دودھ کسی سے مانگا ہے اور نہ پتی —“ اتنا کہہ کر وہ باپ کی باتوں میں سما گئی — وہ رو رہی تھی اور لرزتی آواز میں کہے جا رہی تھی۔

”ابو —! میں نے اس دن آپ کو چائے نہیں پلائی تھی — آپ کی قسم — مم — میں زندگی بھر چائے نہیں پیوں گی — مجھے نہیں معلوم تھا کہ چائے پینے والا میرا باپ ہے — مجھے معاف کر دیں ابو — مجھے معاف کر دیں —“

”لیکلی ایسی باتیں نہیں کرتے — میں نے آج اپنی کھوئی ہوئی منزل کو پایا ہے — میں تو نامکمل تھا — ادھر رہا تھا — بس اپنی مال کا خیال رکھنا — یہ بہت عظیم ہستی ہے — بہت ہی عظیم —“  
 انا باپ کی پیشانی پر بوسہ دے کر بولی۔

”یہ چائے تو پی لیں ابو — م — میں اپنے ہاتھوں سے بنا کر  
 جی ہوں —“

اور تب وارث نے پھر اپنی بیٹی کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔  
 تاریک راہوں کا مسافر — منزل پر پہنچ کر پھر تاریکیوں میں کھو گیا تھا۔  
 ہاں — تاریک راستے اندھے ہوتے ہیں — اور اندھے راستے  
 ہی منزل کا پتہ نہیں دیتے۔

---

# بے ابرو

تحریر: مسلمانانہ

بنگلہ دیش سے آنے والی ایک دوشیزہ کی کہانی۔  
جسے پندرہ سال کی عمر میں آزادی کے نام پر قوم کے رگھوایوں  
نے ہوکس کی سنگینوں پر چڑھا دیا۔

اور وہ بے ابرو ہوتے وقت چھٹی رہی کہ

میں بنگالین نہیں۔ میں بنگالین نہیں۔ میں مسلمان

ہوں شاید اس کے ننھے ذہن میں صرف یہی تھا کہ

مسلمان مسلمان کی عزت کو نہیں لوٹتا۔

زندگی کے ایک ناقابل فراموش حقیقت۔ بوزدہر کہنے۔

قیمت ۲۲ روپے



جب وقت ساز گار ہو تو ایسی ہی کہانیاں منہ بیتی ہیں

# بدن کی آگ

تحریر: میر سنان

اس آگ کی کہانی جو ہر وجود میں بھڑک رہی ہوتی ہے۔ اس عورت کی داستان عبرت جس کے سرد خون میں کوئی بھولی مٹکی چنگار می موجود تھی جس نے بھڑک کر اپنے آپ کو ہی نہیں اپنے گھر کو بھی جلا ڈالا تھا۔

قیمت - ۱۸ روپے

# امریکہ کی ڈائری

تحریر - فن  
ترتیب - مینا نانہ

میں دیکھ کر کہ پاکستانی خلیفہ آباد ہیں

ان انسانوں کی کہانی نوٹورت کو عزت نہیں سمجھتے اس  
معاشرے کی بے ایمانی کی داستان ہے ہم لوگ فینشن  
بھیجتے ہیں۔ اور اپنی نوٹورتوں کو دوسرے کی نوٹورت  
سے بدل لیتے ہیں۔ امریکی معاشرے سے آئی ہوئی ایک  
ڈائری کے اور ان سے مینا نانہ پیش کر رہے ہیں۔  
ان انسانوں کے لیے بطور ہدایت دو مردوں  
کے رنگ اپنا کو اپنا رنگ بھی رکھ  
دیتے ہیں۔

قیمت ۲۲ روپے

# جوانی کے بازار میں

ایک اچھوتی اور زیریںی تحریر

تحریر  
صیناناز

جوانی کے بازار میں لیں دین  
کرتے وقت رشتوں کا خیال نہیں  
رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جوانی  
اپنے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی  
خود ساختہ منطقیں اور فلسفے ایجاد کر لیتی ہے

قیمت ۱۸/- روپے

# جیل کی رائیں جیل کے دن

راوی: اعجاز رشید ڈار  
تحریر: مینا ناز

جرم و سزا  
پر مبنی ایک  
سیچھی داستان

جیل جسے اصلاح خانہ کہا جاتا ہے،  
درحقیقت وہ تباہ خانہ ہوتا ہے جہاں  
سے باہر آکر انسان شرافت کی زندگی نہیں  
گزار سکتا۔ کیونکہ قانون شکنی کے گمراہ  
جیل اسے سکھاتا کہ باہر کی جیبتی ہے۔

ایک زندہ بخوبی جواہر کی آبرو ہے

زندگی کی بساط پر پھیلی ہوئی آگ بارود اور دھوئیں کی کھانی

# جنگِ ابرا اور محبت

راوی :- ام کلثوم  
تحریر :- میسنانہ

وہ مجاہد تھا۔ یا ڈاکو جس نے اپنے خون  
سے افغانستان کی تواریخ کو بدل دیا۔ وہ  
لڑکی جو گھوڑے کی تنگی پیچھے پر سفریوں  
کرتی تھی جیسے بندوق سے نکلی ہوئی گولی  
اور جب دونوں کر دار آلیں میں ٹکرا اے تو  
ہر سو پہاڑیاں — لہو — لہو — ہو گئیں۔

مفت: ام کلثوم

# بے ابرو

تحریر: میمنانہ

بنگلہ دیش سے آنے والی ایک دوشیزہ کی کہانی۔  
 جسے پندرہ سال کی عمر میں آزادی کے نام پر قوم کے رکھوالوں  
 نے ہوس کی سنگینوں پر چڑھا دیا۔  
 اور وہ بے ابرو ہوتے وقت چھٹی رہی کہ  
 میں بنگالین نہیں۔ میں بنگالین نہیں۔ میں مسلمان  
 ہوں شاید اس کے ننھے ذہن میں صرف یہی تھا کہ  
 مسلمان مسلمان کی عزت کو نہیں لوٹا۔

زندگی کے ایک ناقابلِ فراموش حقیقت۔ جو ہر ذہر ہے۔

قیمت ۲۲ روپے





# ہماری مطبوعات

یہ گلیاں یہ چوپارے	۱۸-۰۰	وہ میرا آئیڈیل تھا
یہاں میری گلی ہیں	۱۸-۰۰	طوائف بد معاش اور مولوی
جب میں جوان ہوئی	۱۸-۰۰	داستان سسے جنوں کی
رشتوں کے نہر	۱۸-۰۰	میری بیوی میری قاتل
جنگ جرم اور محبت	۲۴-۰۰	یہ شہزادیاں یہ بادشاہزادیاں
امریکہ کی ڈائری	۲۴-۰۰	بے آبرو
بدن کی آگ	۱۸-۰۰	ایک گھنٹے کا شوہر
جوانی کے بازار میں	۱۸-۰۰	فرشتے کہاں ہیں
اُس رات کے بعد	۱۸-۰۰	میں ایک بیٹی ہوں
سُرتال اور لڑکی	۱۸-۰۰	یورپ کی ٹریجڈی

# ہماری مطبوعات

یہ گلیاں یہ چوپارے	۱۸-۰۰	وہ میرا آئیڈیل تھا
یہاں میری گلی ہیں	۱۸-۰۰	طوائف بد معاش اور مولوی
جب میں جوان ہوئی	۱۸-۰۰	داستان سسے جنوں کی
رشتوں کے نہر	۱۸-۰۰	میری بیوی میری قاتل
جنگ جرم اور محبت	۲۴-۰۰	یہ شہزادیاں یہ بادشاہزادیاں
امریکہ کی ڈائری	۲۴-۰۰	بے آبرو
بدن کی آگ	۱۸-۰۰	ایک گھنٹے کا شوہر
جوانی کے بازار میں	۱۸-۰۰	فرشتے کہاں ہیں
اُس رات کے بعد	۱۸-۰۰	میں ایک بیٹی ہوں
سُرتال اور لڑکی	۱۸-۰۰	یورپ کی ٹریجڈی

انتساب

۱۱۶۷

کالا دھندہ کرنے والوں کے نام  
جو نسل انسان کے قتل ہیں